نورسین
حسینہ حسین
WWW.URDUNOVELSMAG.COM

حسنیٰ حسین

# نورسین

سندس نے پلکیں اٹھا کر والد کو دیکھا، ان کا سوال سنا تو گالوں پر شفق پھوٹ گئی۔ حیا کا ہر رنگ اس کے چہرے پر بکھر گیا اور اس نے کچھ سمٹ کر، کچھ خوشیوں بھرے احساس کے ساتھ سر جھکا لیا۔

اور وہ صدمے سے گنگ دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

محبت ...... سات سالوں کی محبت ......

''مقابل اگر کسی کی چند مہینوں کی ریاضت آجائے تو نتیجہ کیا نکلے گا؟''

''جیت محبت کی ہوگی اور صرف محبت کی۔'' اس

مکمل ناول

www.pdf.pklibrary.com

www.pdf.pklibrary.com

کے اندر باہر بھٹی میں جلتی آگ کا دھواں پھیل گیا۔

"اور اگر "ریاضت" میں کچھ ایسا ہو جو محبت کا ہر اثر زائل کر دے تو؟"

"محبت سیماب نہیں جو اس کا رنگ اور اثر لمحوں میں زائل ہو جائے۔" آتش دان کی لپکتی جھپکتی آگ ایک دم سے باہر نکلی اور اس کا وجود شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ لکڑیوں کی طرح وہ بھی سلگ سلگ کر راکھ ہونے لگی۔

ماں کچھ کہہ رہی تھی۔ والد کچھ پوچھ رہے تھے مگر وہ کچھ سن نہیں رہی تھی۔ سمجھ نہیں رہی تھی۔ وہ بس دیکھ رہی تھی، اس چہرے کو جو ایک دم سے بدل گیا تھا، اس مسکراہٹ کو جس میں تمسخر کے رنگ گھل گئے تھے اور ان آنکھوں کو جن میں استہزاء کی چمک ابھر آئی تھی۔

"نورسین! یہاں آؤ بیٹا۔" ماں نے اسے دیکھا۔

تو ضبط کی حدوں پر قدم جما کر اس نے اپنے آنسوؤں کو آنکھوں کی دہلیز پر مقید کیا اور حلق میں ابھرتے گولے کو نیچے اتار کر لبوں کو جنبش دی۔ کچھ کہنے کے لیے۔ کچھ جاننے کے لیے۔ مگر آواز حلق سے نہ نکلی۔

ماں ایک بار پھر سندس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس کی قسمت کو، نصیب کے اس رنگ کو سراہنے لگی جو اسے بے رنگ کر گیا تھا۔

آج غروب آفتاب سے قبل وہ جن خوشیوں کی مالک تھی وہ خوشیاں مردہ جل پریوں کا روپ دھارے وادی برکان کی گہرائیوں میں کہیں اتر گئی تھیں۔ وہ مسکراہٹیں جو سات سالوں تک اس کے ہمراہ رہی تھیں وہ آتش دان کی آگ میں جل جل کر بھسم ہو رہی تھیں۔ امید کے جگنو جو اس کے پر رونق چہرے کو ہر وقت منور کیے رکھتے تھے۔ وہ بجھ بجھ کر بے وفائی کے اندھیرے میں غرق ہو رہے تھے۔

اس کی نگاہیں سندس کے چہرے پر یوں جمی ہوئی تھیں جیسے وہ پہلی بار اسے دیکھ رہی ہو۔ پرکھ رہی ہو۔ سمجھ رہی ہو۔ تلخ حقیقت نے اندھے اعتماد کی پٹی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس کی آنکھوں پر سے اتاری تھی۔ ہر دو رخی منظر۔ اس کے لیے دن کے اجالے کی طرح یوں واضح ہوا تھا کہ آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں۔

سچائی آفتاب کی کرنوں کی طرح سالوں سے بند آنکھوں پر پڑی تو اسے تکلیف ہونے لگی۔

"بولو منظور ہے؟" والد نے پوچھا۔

ایک موہوم سی امید کے ساتھ۔ اس نے ڈگمگاتی آنکھوں سے سندس کو دیکھا۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید وہ انکار کر دے اور اس کی دنیائے قلب کو اجڑنے سے بچا لے۔ اس آس کے ساتھ کہ شاید وہ پاس رکھ لے، اپنے اس رشتے کا اور اسے بکھرنے سے بچا لے۔

"ہاں۔" جواب مختصر تھا۔

"ہاں؟" نورسین دبے قدم پیچھے ہٹی۔ سامنے کا منظر یکا یک دھندلا گیا۔

سات سالوں کی محبت۔ مدِ مقابل چند مہینوں کی ریاضت۔

ماں نے اسے مخاطب کر کے کچھ کہا۔ باپ نے بھی۔ وہ دونوں پر امید تھے۔ پرسکون تھے، پرجوش تھے۔ آخر کیوں نہ ہوتے؟ یہ اس گھر کی پہلی خوشی تھی۔ لیکن یہ پہلی خوشی اسے کرب کا ایک ایسا زخم دے گئی تھی جس کے نشان تا عمر رہنے والے تھے۔

کمرے میں جب ان دونوں کے سوا کوئی نہ رہا تو اس نے آنسوؤں سے نم ہوتی، صدمے سے ڈگمگاتی نگاہوں سے اپنی بہن کو دیکھا۔ یوں جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کہ...... کیوں؟" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

"اس نے کہا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے نور!"

وہ لفظ نہیں نشتر تھے جو وجود کے آر پار ہو کر اس کی روح کو گھائل کر گئے تھے۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔" اس نے آنسوؤں کا پھندا اپنے حلق سے اتارا۔ "یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں پچھلے سات

www.pdf.pklibrary.com

سالوں سے اس کی منتظر ہوں، اس کے باوجود۔ اس کے باوجود تم نے۔ تم نے ہاں کر دی؟''

اس کا چہرہ جذبات کی حدت سے سرخ ہو رہا تھا اور آواز صدمے کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

''اس نے کہا، وہ مجھے اپنانا چاہتا ہے، مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے، میں انکار کیسے کر دیتی؟'' وہ سراپا سوال بنی اسے دیکھنے لگی۔

بے حسی کی انتہا۔ صدمہ۔ در صدمہ۔

''کب سے۔ کب سے چل رہا۔ ہے یہ سب۔'' آواز بھیگی تھی۔ لفظ ٹوٹے تھے۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق پڑتا ہے۔'' اس نے ضبط کر کے اپنی آواز کو بلند ہونے سے روکا۔

سندس نے گہری سانس لے کر اکتاہٹ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''چھ ماہ قبل عبدالعلیم صاحب کے کتب خانے میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔''

''تم نے اس کی اتنی تعریفیں کر ڈالی تھیں کہ میں اس سے ایک دفعہ ملنا چاہتی تھی۔''

نورسین نے لبوں سے نکلتی کراہ کو لب بھینچ کر دبا لیا۔

''کوئی اتنا خوب صورت، اتنا ذہین، اتنا مکمل کیسے ہو سکتا ہے نورسین؟ وہ تو ایک ساحر ہے، برکان کا ساحر!''

شمع دان یک دم بے نور ہو گئے۔ آس پاس کے اندھیرے اتنے بڑھ گئے کہ اسے سندس کا وجود بمشکل دکھائی دینے لگا۔

برکان کا ساحر جس طرح اس کے حواسوں پر چھایا رہتا تھا بالکل اسی طرح اب وہ سندس کے حواسوں پر بھی چھایا ہوا تھا۔ وہ تعریفی اور توصیفی جملے جو ساحر کے لیے اس کے دل سے نکلتے تھے، وہ اب سندس کے دل سے بھی نکل رہے تھے۔

''مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں اسے دل دے بیٹھوں گی۔'' وہ محبت سے سرشار لہجے میں اعتراف کر کے بے خودی کے عالم میں مسکرا دی۔ ''میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔ وہ بھی مجھے دل کی آنکھ سے دیکھے گا، مجھے چاہے گا اور اس گھر کی دہلیز پر میرا ہاتھ مانگنے آ جائے گا، یہ سب۔ ایک خیال سا۔ ایک خواب سا لگتا ہے نور۔''

اور نورسین صدمے سے گنگ کھڑی رہ گئی۔

''دل یوں بھی جڑتے ہیں اور خواہشیں یوں بھی پوری ہوتی ہیں؟'' اب وہ کہہ رہی تھی۔

''یقیناً وہ میرا نصیب ہے۔ یقیناً وہ بنا ہی میرے لیے ہے۔'' وہ شاید خود کو یقین دلا رہی تھی۔

''ورنہ وہ تمہیں کیوں چھوڑتا؟ مجھے کیوں چنتا؟'' اس کا ایک ایک لفظ نورسین کو وادیٔ برکان کی دلدل میں اتار رہا تھا۔

وہ سسکتے ہوئے پیچھے ہوتی گئی یہاں تک کہ منظر سے ہٹ کر دیوار سے جا لگی۔

سات سال!

ایک طویل مدت۔

ایک طویل انتظار کے بعد۔

اسے ملا بھی تو کیا؟

ایک سراب!

ایک خواب!

ایک دھوکا!

اسے آتش دان کی آگ پورے گھر میں پھیلتی محسوس ہوئی۔ وجود میں اتنا دھواں بھر گیا کہ اس کے لیے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ پھولے تنفس کے ساتھ دروازہ دھکیل کر باہر آ گئی۔

''مرد جس عورت سے محبت کرتا ہے، اسے انتظار کی سولی پر نہیں لٹکاتا۔ جس سے شادی کرنا چاہتا ہے اسے حیلے بہانوں سے نہیں ٹالتا! وہ ایک قدم آگے بڑھا کر دس قدم پیچھے نہیں ہٹتا۔'' اس نے سر اٹھا کر نم آنکھوں سے آسمان کو دیکھا۔ اوپر دھند تھی۔ دبیز دھند۔

www.pdf.pklibrary.com

سات سال!!!!
ایک ہی آواز......
ایک ہی صدا......
سات سال!!!!!

☆☆☆

رات کی سیاہی وادی برکان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ خنک ہوائیں ہر گزرتے لمحے زور پکڑ رہی تھیں۔ روئی کی مانند برف کے نرم گالے فضا میں بکھر کر زمین پر اتر رہے تھے۔

"مرد جس عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ جسے اپنانے کی چاہت رکھتا ہے، اسے کھونے سے ڈرتا ہے اور جسے کھونے سے ڈرتا ہے اس کی دہلیز پر آ جاتا ہے، اس کے باپ سے اس کا ہاتھ مانگنے کے لیے۔"

وہ سراپا حزن ہی برف کی بے داغ پوشاک پر قدم اٹھاتی کھائی کی طرف بھاگ گئی۔ آبادی سے دور نشیب میں ایک جنگل تھا۔ برکان کا واحد جنگل جس میں لوگ شب کی تاریکی میں داخل ہونے سے کتراتے تھے۔ جنگل کا دوسرا کنارہ چونکہ قریب ہی ساحل سمندر سے جا ملتا تھا اس لیے تلاطم خیز لہریں اپنے شور سے وادی کو گھیرے رکھتی تھیں۔

"کیوں؟ کیسے؟ کس لیے؟" سوال ایک سا تھا۔ مختصر سا۔

جواب کہیں نہ تھا۔ کسی رنگ میں نہ تھا۔

"کیا کمی تھی میری محبت، میرے خلوص، میری چاہت میں؟" وہ درختوں کے جھنڈ میں کہیں گھٹنوں کے بل نیچے گری اور نم مٹی کو مٹھیوں میں بھر بھر کر رونے لگی۔

"مجھے اس اذیت میں کیوں دھکیل دیا گیا؟ آخر کیوں؟ صرف محبت ہی تو کی تھی میں نے۔ کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔ کسی کا دل تو نہیں توڑا تھا۔ ایک خواب ہی تو دیکھا تھا۔ ایک چاہ ہی تو رکھی تھی۔" وہ سسکتے ہوئے جھک گئی۔ آنسو گالوں پر پھسل کر مٹی میں جذب ہونے لگے۔

"کوئی کمی نہیں تھی، اس لیے تو یہ سب ہوا۔"

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ چونک کر سر اٹھایا۔

"تمہاری محبت میں، خلوص اور چاہت میں کہیں کوئی کمی نہ تھی۔" فضائیں یک زبان بول اٹھیں۔

"کمی اس کے خلوص میں تھی۔" آسمان کی دھند چھٹ گئی۔ چاند واضح ہو گیا۔ "کمی اس میں تھی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"میں نے سب کچھ کھو دیا۔ سب کچھ۔" اس کے لب ہلے۔

"تم نے کچھ نہیں کھویا! تم نے کچھ نہیں کھویا۔" ہوا پتوں سے سرسرا کر گزری۔ "جو کھویا اس نے کھویا...... جو کھویا اس نے کھویا۔"

"میں نے سات سال اس پر اعتبار کیا۔ سات سال اس کا انتظار کیا۔" وہ اطراف میں نگاہ دوڑاتے ہوئے قدرت کی ہر شے سے مخاطب ہوئی۔ "میں سات سال تک اپنے دل میں اس کا خیال جمائے مستقبل کے خواب بنتی رہی۔ اسے چاہتی رہی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تمہیں تمہاری محبت کے شفاف جذبے نے ایک ایسے شخص سے منسلک ہونے سے بچا لیا جو نہ وعدوں کا پاس رکھنا چاہتا ہے، نہ محبت کے احترام کو مانتا ہے۔" چاند کا عکس نہر کے شفاف پانی پر جھلملانے لگا۔

"نقصان اس کا ہوا ہے، تمہارا نہیں۔"

"محبت اس نے کھوئی ہے، تم نے نہیں۔"

نورسین کی گہری بھوری آنکھوں میں برکان کا سمندر آ کر موجزن ہو گیا۔

وہ ساکت نگاہوں سے اطراف میں دیکھنے لگی۔ چاند، ستارے، کھلی فضا، درخت، پتے، جھاڑیاں، نہر، جھیل اور سمندر کی لہریں۔ سب یک زبان ہو کر اسے تسلی، دلاسا دے رہے تھے۔ وہ چپ چاپ انہیں سن رہی تھی۔

"محبت اس پر اثر کرتی ہے جس کے دل میں

www.pdf-pklibrary.com

خلوص اور محبت کا احترام ہو، جس کے دل میں یہ نہ ہو اس پر محبت اثر نہیں کرتی۔" سب نے کہا۔

اس نے سنا۔ اس نے تسلیم کیا۔

"ماں کہتی ہے نور سین! سندس کا عروسی جوڑا تمہاری فنکار انگلیاں تیار کریں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم تیار کر دینا۔" اس کی ہمت بڑھائی گئی۔

"والد نے کہا نور سین! دولہا کو جو گھڑی تحفے میں دینی ہے، اسے میں پسند کروں۔" اس نے آنکھوں میں ابھرتی نمی کو اندر اتارا۔

"تم پسند کر دینا۔" حل پیش کر دیا گیا۔

"نور سین۔"

[illegible] سے مجبور ہو کر اسے پکارا۔ "کیا اسے علم ہے، وہ تمہاری بہن سے شادی کر رہا ہے؟"

"نہیں۔"

ہر شے پر جیسے ایک سکوت چھا گیا۔

وہ چند ثانیوں تک وہاں کھڑی رہی پھر آنسو پونچھ کر جانے کے لیے مڑ گئی۔

جب وہ جنگل سے نکل کر وادی میں داخل ہو رہی تھی تو اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ چاند روشن تھا۔

اسے اپنا اندر باہر یک دم روشن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

"یہ میری غلطی ہے کہ میں سات سالوں تک "حسنا والنائمہ" بنی وہ خواب دیکھتی رہی جس کی کوئی تعبیر نہ تھی۔ مگر اب میں بیدار ہو گئی ہوں بدر! اب میں خود کو سنبھال لوں گی۔" اس نے نم آنکھوں کے ساتھ پرعزم لہجے میں کہا۔

بدر کھلے آسمان پر پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔

"میں اب جاگ گئی ہوں، میں اپنا خیال خود رکھ لوں گی۔"

وہ کہہ رہی تھی۔ گویا خود کو بتا رہی تھی۔ سمجھا رہی تھی۔

"میرے حصے کی جتنی خوشیاں، مسکراہٹیں ہیں وہ مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" اس کا لہجہ مضبوط ہوا تھا۔

"کوئی ایسا انسان تو ہرگز نہیں جسے وعدوں کا پاس رکھنا نہ آتا ہو۔"

قدرت کی ہر شے نے اسے زندگی کا سفر احسن طریقے سے جاری رکھنے کا پیغام دیا تھا اور وہ اس پیغام کو نصیحت سمجھ کر اس پر عمل کرنے کا عزم لیے گھر کو چل دی تھی۔

اس وقت انتظار کی کوئی شمع اس کے کمرے میں نہ جلی تھی۔

اس وقت اس کا تکیہ آنسوؤں سے نہ بھیگا تھا۔

اس رات جب وہ سوئی تھی تو اس نے کوئی خواب، کوئی خیال، کوئی تصور نہ دیکھا تھا۔

اس رات اس کے دل و دماغ میں کھو جانے کا، بچھڑ جانے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

نئے دن کا سورج نور سین کی زندگی کا ایک نیا آغاز دیکھنے والا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن علی الصبح وہ وادی برکان کی فلک بوس چٹانوں کا نظارہ کرتی، بلندی کے کنارے پتھر پر لباس کا دامن پھیلائے خاموش بیٹھی تھی جب وہ اس کے عقب میں آن کھڑا ہوا تھا۔

ان کی پہلی ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ ان کی آخری ملاقات بھی یہیں ہونی تھی۔

وہ اس کے لیے وہاں نہیں آئی تھی۔ نہ پہلی بار، نہ آخری بار۔ وہ سات سال پہلے اس کے لیے یہاں آیا تھا۔ وہ سات سال بعد بھی اس کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔

سات سال پہلے اپنی محبت کا یقین دلانے۔

سات سال بعد اپنی مجبوریوں کا احساس دلانے۔

وہ کہتا رہا، وہ سنتی رہی، دار ہوتے رہے، وہ سہتی

رہی۔

اس کا ہر عذر دل میں نیزے چبھو رہا تھا۔ اس کی ہر مجبوری خون کے آنسو رلا رہی تھی۔

"یہ میری ماں کی خواہش ہے، لڑکی انہوں نے ہی پسند کی ہے۔"

برکان کی فلک بوس، برف پوش چٹانوں سے سورج کی تمازت سے پگھل کر برف کے تودے لڑھکنے لگے تو اسے بھی اپنا وجود بلندیوں سے گرتا ہوا محسوس ہوا۔

"میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں، انکار نہ کر سکا۔"

سات سال پہلے کوئی اجنبی پل میں اپنا ہوا تھا۔

سات سال بعد کوئی اپنا پل میں اجنبی ہوا تھا۔

"محبت میں نے صرف تم سے کی ہے، اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔"

یہ جملہ بڑا کھوکھلا تھا۔ اس کی گونج نہ جانے کہاں کہاں تک گونجی تھی۔

پچھلے سات سالوں میں اس نے یہ جملہ نہ جانے کتنی بار سنا تھا۔ نہ جانے کتنی بار اس کا دل اعتراف پر دھڑکا تھا۔ وہ دن میں نہ جانے کتنی بار اس پل کو جیتی تھی۔ نہ جانے کتنی بار ہنستی تھی۔ مسکراتی تھی۔

آج محبت کا اعتراف اسی انداز میں، اسی لہجے میں، اسی آواز میں ہوا تھا۔

مگر اس مرتبہ نہ شفق پھوٹی تھی نہ قدرتی رنگ بکھرے تھے، نہ بہار اتری تھی نہ پھول کھلے تھے، نہ فضا معطر ہوئی تھی نہ خواب نکھرے تھے۔

دل کیا بدلا، احساس ہی بدل گئے تھے، یقین کیا ٹوٹا، ارمان ہی بکھر گئے تھے۔

"مجھے اس بات کا افسوس ہے، اور یہ افسوس مجھے تاعمر رہے گا۔" اس کی خاموشی سے وہ کچھ بے چین ہوا تھا۔

---

نورسین کی برکان کی بلند و بالا چوٹیوں پر پھسلتی نگاہیں ایک ہی مقام پر ٹھہر گئیں، آنکھوں کی نمی خشک ہو گئی۔

"تم اب جا سکتے ہو۔" اس کی آواز صاف تھی۔ لہجہ بے حد مضبوط۔ کہیں کسی دکھ، غم یا کرب کی جھلک نظر نہ آتی تھی۔

"نورسین میں تم سے معافی۔"

"تم جا سکتے ہو۔" اس نے بات کاٹ دی۔ وہ پتھر پر بلندی کے کنارے اس رخ بیٹھی تھی کہ محمود اس کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھا۔

"تم یقیناً اس وقت مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہو گی۔ میں ابھی چلتا ہوں۔ ہم دوبارہ ملاقات کریں گے۔"

"ہم دوبارہ کبھی ملاقات نہیں کریں گے۔"

دوسری طرف ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

وہ لباس کا دامن سمیٹتے ہوئے پتھر سے اتر گئی اور اسی رخ اپنا چہرہ اس کی نظروں سے اوجھل کیے پگڈنڈی کی جانب بڑھنے لگی۔

"نورسین!"

"میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔" جاتے سے اس نے کہا۔ "انتقام بھی نہیں لوں گی۔ میں ان سات سالوں کا حساب اپنے رب پر چھوڑتی ہوں۔"

عقب کی خاموشی موت کے سناٹے میں بدل گئی۔

اسے روکا نہ گیا، پکارا نہ گیا۔ اسے جانے دیا گیا۔

کھوکھلے لفظ اس پر اب اثر نہ کرتے تھے۔

ساحر کو اپنی یہ کوشش اس لمحے فضول لگی تھی۔

اس کا خیال تھا یقیناً وہ صدمے میں ہے۔ تب ہی وہ بے رخی برت رہی ہے۔ محبت میں جس کا پور پور غرق ہو وہ اس کے بنا کیسے جی سکتی ہے؟ کیسے ربط وضبط کے بنا رہ سکتی ہے؟

یقیناً وہ اس کے لیے واپس آئے گی۔ خط و کتابت کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گا۔ دن کے اجالے میں خفیہ ملاقات کی گھڑیاں پھر سے میسر ہوں گی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گا۔ پہلے کی طرح ہوتا رہے گا۔

www.pdf-pklibrary.com

وہ ایک ساحر تھا۔ اسے اپنے سحر پر پورا یقین تھا۔ نہ اس نے کبھی کچھ کھویا تھا اور نہ کسی فیصلے پر پشیمان ہوا تھا۔ فکر کس بات کی؟ غم کس امر کا؟

اس لمحے جب وہ واپس پلٹ رہا تھا۔ اس وقت تقدیر نے نصیب کے صفحوں کو الٹ دیا تھا۔

ایک روایت جو پچھلے پندرہ برس سے اس کی زندگی میں چلی آرہی تھی۔ وہ روایت اس معاملے میں بھی برقرار رہے گی اس کا اسے قطعاً اندازہ نہ تھا۔ اندازہ ہوتا تو یقیناً اس کا فیصلہ مختلف ہوتا، اس کا جواب مختلف ہوتا، اس کا عذر بھی مختلف ہوتا۔

مگر جو لکھا جاچکا تھا اسے مٹایا نہ جاسکتا تھا۔ فیصلہ اٹل تھا۔ فیصلہ اٹل ہی ہوتا ہے۔ تقدیر دعاؤں سے بدل جاتی ہے نداؤں سے نہیں اور تقدیر کے انصاف پہ مبنی فیصلے قطعی ہوتے ہیں۔ غیر متزلزل۔

☆☆☆

وہ محمود تھا۔ عزمی خاندان کا چشم و چراغ۔

بے مثال حسن کا مالک۔

باکمال کامیابیوں کا حق دار۔

پر اثر شخصیت۔ پختہ عادات اطوار۔

صاحب کمال۔ صاحب جمال۔

حسن اس کی کمزوری تھی، مردانہ وجاہت اس کا مضبوط ہتھیار۔

شہر بریدہ کے مکین اسے ساحر کے نام سے جانتے تھے۔ وہ تھا ہی ایسا۔

منفرد شخصیت کا مالک۔ باشعور تاجر۔ باکمال شاعر۔ گھر کا اکلوتا فرزند۔ محبت اور چاہتوں کا اکلوتا وارث۔

ایسی کون سی شے تھی جو اس کی دسترس میں نہ تھی؟ ایسی کون سی چیز تھی جس کا وہ مالک نہ تھا؟ ایسا کون سا خواب تھا اس کا جو پورا نہ ہوا تھا؟

وہ کچھ بھی حاصل کرسکتا تھا۔ حسن کی کسی بھی دیوی کو رام کرسکتا تھا۔

خوش گفتار تھا وہ۔ خوش اخلاق بھی۔ محض مسکراہٹ ہی کچھ ایسا اثر کرتی کہ پہلی ملاقات میں خواب بننے والیاں خواب بن لیتیں، محبت کرنے والیاں اظہار کردیتیں۔

مگر اس نے چاہا کسے تھا؟

یہ بات سو فیصد درست تھی کہ وہ نورسین کی علمی قابلیت سے متاثر ہوا تھا۔ اس کی سوچ، اس کی فہم و فراست اور اس کی ذہانت کا قائل ہوا تھا۔ اسے نورسین کی آواز دل فریب لگی تھی۔ لہجہ پراثر لگا تھا۔ وہ بات کرتی تھی تو اس کا ایک ایک لفظ گہرا، بامعنی اور اسرار سے بھرپور ہوتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ دلکش تھی۔ آنکھیں پُرکشش۔ وہ حسن میں بے مثال تو نہ تھی۔ شخصیت میں باکمال ضرور تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال سحر زدہ تو نہ کرتے تھے مگر گہری پراثر آنکھیں ساکت ضرور کرتی تھیں۔

محبت شاید اس نے نورسین سے کبھی نہ کی تھی۔ وہ اس سے متاثر ضرور ہوا تھا مگر اس نے نورسین کے لیے وہ محسوس نہ کیا تھا جو وہ اس کے لیے کرتی تھی۔ وہ نہ دیکھا تھا جو وہ اس میں دیکھتی تھی۔ اس کے باوجود محبت کے اعتراف میں پہل اس نے کی تھی۔ شادی کا وعدہ بھی اس نے خود کیا تھا۔ محبت کا یقین بھی اس نے خود دلایا تھا۔

وہ ساکت جھیل میں کنکر پھینک کر لہروں کا رقص پرتپاک انداز میں دیکھا کرتا تھا۔ نورسین کے ساتھ بھی اس نے یہی کیا تھا۔ کیوں؟ معلوم نہیں! کس لیے؟ خدا جانے!

دل کے معاملات میں اس نے کبھی دخل اندازی نہ کی تھی۔ نہ ہی اس نے دل کو اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ اس کے حواسوں پر سوار ہو کر اسے وہ بتاسکے جو وہ سننا نہیں چاہتا۔ وہ سنا سکے جو وہ سمجھنا نہیں چاہتا۔

وہ سب ایک وقت گزاری تھا شاید۔ ایک کھیل۔ ایک تفریح۔ دلچسپی کا مظہر لیے ایک تصویر۔ ایک تحریر۔ یا شاید کچھ بھی نہیں۔

اس کا ہر فیصلہ اٹل ہوتا تھا۔ جس پر اسے پھر کوئی پچھتاوا نہ ہوتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنے جذبات کو

سمجھتا تھا اور شاید اس لیے بھی کہ وہ خود کو سمجھتا تھا۔

اسے کیا چاہیے اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ ہمیشہ اس کا دماغ کرتا تھا۔ دل کی تو اس نے کبھی سنی ہی نہ تھی اور یہ بھی محض چھ ماہ پہلے تک کی بات ہے۔

زندگی میں پہلی بار دل کی آواز اس نے علیم صاحب کے کتب خانے میں سنی تھی۔ وہ آواز اتنی شیریں اور دل نشیں تھی کہ وہ کچھ ثانیوں تک اس کے سحر سے نکل ہی نہ سکا تھا۔

محبت پہلی نظر کی تھی۔ وار پہلی ملاقات میں ہوا تھا۔ شریک حیات کا فیصلہ بھی چند گھڑیوں میں ہوا تھا۔ دھڑکنوں نے اپنی لے بدلی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔

دل نے گواہی دی بریدہ شہر اور اس کے اطراف میں۔ موتیوں کی طرح بکھری وادیوں میں فقط ایک ہی جوہر نایاب ہے جسے اس کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ تاریک دل میں محبت کی شمع جل اٹھی۔

قلب و عقل نے یکجا ہو کر ایک ہی صدا لگائی۔

”یہی ہے وہ ”امیرالاحلام“ (خوابوں کی شہزادی) جسے تمہارے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔“

وادی برکان کے ایک نامور تاجر کی بیٹی۔

شاہزادی سندس۔

حسن بے نظیر کی اعلا مثال!

بے مثال، باکمال، اسرار سے بھرپور ایک ہوش ربا شہزادی۔ جو اس کے لیے بنی تھی۔ صرف اس کے لیے۔

☆☆☆

”آپ یہ دیکھ کر بتا دیجیے کہ عروسی جوڑا کس طرز کا ہونا چاہیے۔“

ماں نے عروسی جوڑے کی سلائی کا کام اسے سونپا تھا۔ وہ لباس کے تیار کیے گئے چند خاکے انہیں دکھا کر، ان کی رائے لینا چاہ رہی تھی۔ تاکہ وہ یہ کام جلد سے جلد نہ صرف شروع کر سکے بلکہ وقت سے پہلے پایۂ تکمیل کو بھی پہنچا سکے۔

والدہ نے مٹیالے رنگ کے صفحوں پر خوب صورتی سے منقش ملبوسات کو دیکھنا شروع کیا۔ انہیں سفید اور سنہری رنگوں کے امتزاج کا ایک خاکہ بڑا پسند آیا۔

”سندس میری بیٹی! ذرا اسے دیکھو! یہ تم پر بہت جچے گا۔“

کمانیاں اور گدیاں لگی مجلس کی نشست پر دراز سندس نے والدہ کے کہنے پر ذرا سا سر اٹھا کر میز پر بکھرے صفحوں کو سرسری نگاہوں سے دیکھا پھر حتمی لہجہ میں کہہ اٹھی۔

”میں اپنا عروسی جوڑا ام ہانی سے سلوانا چاہتی ہوں ماں۔“

”مگر تم تو کہتی تھیں، تمہارا جوڑا عروہ سیے گی۔“

ماں حیران ہوئی تھی۔

”وہ پہلے کی بات ہے ماں! میں اب اپنا جوڑا ام ہانی سے سلواؤں گی اور اس کے لیے شہر بھی میں خود جاؤں گی۔“ اپنی بات کے اختتام پر اس نے فاتحانہ نگاہوں سے نورسین کو یوں دیکھا تھا جیسے وہ اس کے چہرے پر گہری مایوسی کا تاثر دیکھنے کی خواہش مند ہو۔

نورسین کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ہر تاثر سے مکمل طور پر عاری۔

غم، کرب، غصہ، حسد، عداوت، الم۔ اس کے چہرے پر ان کا کوئی رنگ نہ تھا۔ کوئی تحریر نہ تھی۔

”لیکن...“ والدہ نے کوئی جواز پیش کرنا چاہا۔

”ام ہانی ایک باصلاحیت خیاطہ (کپڑے سینے والی) ہے ماں! مجھے یقین ہے میرے عروسی جوڑے میں وہ کوئی نقص کوئی کمی، کوئی خامی پیدا نہ ہونے دے گی۔“ نورسین کے چہرے پر نظریں گاڑے اس نے توجیح پیش کی تھی۔

عیب دار لوگوں کو ہر شے بے عیب چاہیے۔ آنکھیں روح کی گہرائیوں میں اترا کرتیں تو لوگ اپنے عیب چھپانے کے لیے کیا کرتے؟ اس نے سوچا اور میز پر سے اپنے خاکے اٹھا لیے۔

”سندس ٹھیک کہہ رہی ہے ماں! میں بھی یہی چاہتی ہوں جوڑے میں کوئی نقص، کوئی کمی، کوئی خامی

www.pdf.pklibrary.com

نہ ہو۔"

سندس نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔

والدہ اور سندس کے مابین مزید کیا بات ہوئی تھی، کیا سوچا گیا تھا، کیا طے پایا گیا تھا، اسے معلوم نہ تھا کیونکہ وہ اپنے خاکے سنبھالے اسی وقت مجلس سے چلی گئی تھی۔

"میں جانتی ہوں، تم کیا کرنے کی کوشش کر رہی ہو، میں تمہاری کسی بھی چال کو کامیاب نہ ہونے دوں گی۔"

اس وقت جب وہ اپنے کمرے میں دراز سے اپنے پیسوں کی تھیلی نکال رہی تھی اس وقت سندس نے دروازے میں رک کر قہر بھرے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

"میں کیا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں؟" اس نے کمر کے گرد لپٹی ہوئی سیاہ پٹی کے ساتھ تھیلی کے کنارے لگی ڈوریوں کو اچھی طرح سے باندھتے ہوئے سر اٹھایا۔

"تم نے اگر میرے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کی تو میں خاموش نہ رہوں گی۔" سندس نے انگلی دکھا کر اسے دھمکی دی تھی۔

"مجھ میں اپنا عکس تلاشنے کی جستجو مت کرو۔ میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔"

بات سادہ تھی، لہجہ سخت۔ حقیقت کی تلخی لیے بے رحم لفظوں نے سندس کو ایک لمحے کے لیے قوت گویائی سے محروم کر دیا تھا۔ اس کے لب بھنچے تھے، مٹھیاں بند ہوئی تھیں۔ اور چہرہ غصے کی شدت سے یکا یک سرخ ہوا تھا۔

نفرت، حقارت، عداوت اور بغض کی ایسی کونسی لکیر تھی جو اس لمحے اس کی بھوری آنکھوں میں نہ ابھری تھی۔ ایسا کون سا تاثر تھا جس نے اس کے چہرے پر گہری عداوت کی حکایت رقم نہ کی تھی۔

"میں نے تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی، سنا تم نے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں کب آئی تمہارے راستے میں؟ کب رکاوٹ بنی ہوں میں؟ وہ میرا نصیب تھا جسے تم اپنا سمجھ بیٹھی تھیں۔ وہ میرا خواب تھا جس کی تم تعبیر سوچ رہی تھیں۔ وہ میری منزل تھی جس تک تم پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں! قصور کس کا ہوا پھر؟ میرا یا تمہارا؟ غلطی کس کی ہوئی پھر؟ میری یا تمہاری؟ کیا تم سن رہی ہو؟ کیا تم سمجھ رہی ہو؟"

آنکھوں کی نمی ضبط کیے نورسین چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

"ایسے کیوں دیکھتی ہو مجھے جیسے میں نے تمہارا حق تم سے چھین لیا ہے؟ کیا مجھے اب بھی یہ بات دہرانے کی ضرورت ہے کہ وہ میرا تھا، میرا ہے، میرا رہے گا۔"

"دعا کرو، وہ تمہارا ہی رہے۔" اس نے سنگھار میز پر سے چابی اٹھالی۔

"للکار رہی ہو تم مجھے؟" سندس سانپ کی طرح پھنکاری تھی۔

"جسے تم للکار سمجھ رہی ہو، وہ میری دعا ہے۔" اس نے چابی لباس کی جیب میں رکھ لی۔

"اچھا مذاق ہے یہ۔" سندس کو ہنسی آگئی۔ تمسخر اڑاتی ہنسی۔

تکونی سروں والی سنہری ردا کندھوں پر ڈالتے جس خاموشی اور متانت سے نورسین کمرے میں داخل ہوئی تھی اسی خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

آزمائش کا ہر دورانیہ کٹھن ہوتا ہے۔ کڑا، سخت، روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا۔

مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ آزمائش تھی یا سزا؟ امتحان تھا یا جزا؟

اپنے والدین اور ملازمین کے ساتھ وہ جس شان سے گھر میں داخل ہوا تھا اور جس شان سے وہ اس کے ماں باپ کے سامنے داماد کی حیثیت سے جھکا تھا اس شان نے، لبوں پر مچلتی پرکشش مسکان نے اور چہرے پر بکھرے مسرت کے تاثرات نے

www.pdf.pklibrary.com

اسے اندر سے کرچی کرچی کر دیا تھا۔

دوسری منزل کی بالکنی ہر منظر دکھا رہی تھی۔ ہر وہ منظر جس کے لیے وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی۔ یہ صرف اس کا خیال تھا۔ ابھی تو تقریب نکاح بھی ہونا تھی، دعوت ولیمہ بھی سرانجام پانا تھی، ابھی تو اور بہت سی محفلیں سجنی تھیں۔ مگر اس سے پہلے، ابتدا سے بھی پہلے اس کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹ رہا تھا۔

جی چاہا وہ ایک بار پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر برکان کے جنگل میں کھو جائے، ایک بار پھر روئے، چیخے، چلائے، شکوہ کرے۔

اسے ایک بار پھر تسلی دی جائے،

اسے ایک بار پھر حسناء النائمہ بننے سے بچایا جائے......

کرب شاید محبت کا نہ تھا۔

کرب رشتے کا تھا، خون کا تھا، اعتماد کا تھا، یقین کا تھا،

کرب اس عہد کا تھا جسے دفنا کیا گیا تھا۔

کرب اس خواب کا تھا جسے بے دردی سے توڑا گیا تھا۔

صبر آئے بھی تو کس طرح؟ حوصلہ بڑھے بھی تو کس طرح؟ کیسے سنبھالے وہ خود کو؟ کیسے کرچی کرچی ہونے سے بچائے؟

گزشتہ شب برکان کی گہرائیوں میں، پتوں، جھاڑیوں، درختوں، بیل بوٹوں اور برکان کی پراسرار فضاؤں کو گواہ بنا کر کیے جانے والے عہد کو اس نے پھر دہرایا۔

"غم اسے کرنا چاہیے جو گہری نیند میں ہے، اسے نہیں جو بیدار ہو چکا ہے۔"

اس نے لب بھینچ کر خود کو مزید رونے سے باز رکھا اور اپنے آنسو صاف کر لیے۔ کہ مہمانوں کی میزبانی کے فرائض اس نے سرانجام دینا تھے۔ قہوہ اور مشروبات پیش کرنے کے لیے ملازمین کو احکامات اس نے جاری کرنا تھے۔ طعام گاہ کی دیکھ بھال اور کھانے کے لوازمات کی ترتیب اس کے ذمہ تھی اور والدین کی خوشیوں میں شریک ہونا اور ان کے لیے باعث راحت بننا اس کے اولین فرائض میں شامل تھا۔

اپنے لیے، اپنی عزت کے لیے، اپنی انا اور عزت نفس کے لیے اسے ہر حال میں نہ صرف خود کو مضبوط ظاہر کرنا تھا بلکہ باطنی طور پر بھی خود کو جوڑ کر، سمیٹ کر رکھنا تھا۔

آنکھ نم نہ ہو۔

نہ لب کپکپائیں۔

نہ آواز لڑکھڑائے۔

اور یونہی وہ خود کو مضبوطی سے جوڑ کر کمرے سے باہر نکلی۔

جھکے کندھوں کو سیدھا کیے، چہرے کے تاثرات موقع کی مناسبت سے خوشیوں میں ڈھال کر سر اٹھائے۔ وہ نیچے آئی۔

پہلے وہ طعام گاہ میں گئی جہاں اس نے قہوہ اور مشروبات کے انتظام کا ازسرنو جائزہ لیا تاکہ کوئی کمی نہ رہے۔ پھر وہ مجلس میں مشروبات کی طشتریاں لے جانے کی ہدایت دے کر ملازمین کے ساتھ وسیع و عریض مجلس میں داخل ہوئی جسے موقع کی مناسبت سے پرکشش انداز میں سجایا گیا تھا۔

"السلام وعلیکم۔" اندر داخل ہوتے ہی اس نے مہمانوں کو مشترکہ سلام کیا۔

مجلس میں براجمان سب ہی افراد کی نگاہ اس کی جانب اٹھی تھی۔ اس کی بھی جو اس مانوس آواز پر یک دم چونکا تھا، ٹھٹکا تھا۔

"یہ میری دوسری بیٹی ہے، نورسین! سندس سے سال بھر چھوٹی ہے۔" والدہ نے جو دولہا کی ماں کے ساتھ بیٹھی تھی، تعارف کروایا۔

برکان کی فلک بوس چٹانیں ایک دھماکے سے کسی کے سر پر ٹوٹی تھیں۔ ہونے والے دولہا کا چہرہ یکایک تاریک ہوا تھا، ہاتھوں میں دبا پانی سے لبریز شیشے کا ظرف بھی لڑکھڑایا تھا۔

مروت سے مسکراتے ہوئے نورسین امجاد نے ملازمین کو راستہ دیا تھا۔

قطار میں ملازمین اندر داخل ہوئے، وہ زرکار طشتریاں ہاتھوں میں دبائے مہمانوں کے سامنے ٹھنڈے مشروب کا ظرف اور پیالیوں میں قہوہ بھر بھر کر رکھتے جاتے تھے۔

دولہا کے والدین اور ان کے قریبی رشتہ دار، دلہن کے والدین اور ان کے چند عزیز اقرباء ایک بار پھر سے گفتگو کرنے لگے تھے۔ آوازیں ابھر رہی تھیں، ہلکے ہلکے قہقہے گونج رہے تھے۔ مسرت کے احساسات کے ساتھ خوشیوں کے رنگ بھی بکھر رہے تھے مگر برکان کے نامور تاجر کی وسیع و عریض مجلس میں بیٹھے دولہا کے لیے وہ جگہ یکا یک تنگ ہونے لگی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا۔

کیوں؟ معلوم نہیں! کس لیے؟ خدا جانے!

دولہا کے پاس آ کر اس نے میز پر اپنے ہاتھوں سے قہوے کی پیالی رکھی، مشروب سے بھرا ظروف رکھا۔ ایک ثانیے کے لیے دونوں کی نظر ملی۔ ایک لمحے کے لیے گزشتہ سات سال ان آنکھوں میں سمائے۔

”میں نے اپنی چھوٹی بہن کو بتایا ہے، تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔“ دولہا کے ذہن میں سندس کی آواز گونجی تھی۔

”یہ رشتہ میری ماں کی پسند سے طے پایا ہے۔ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ انکار نہ کر سکا۔“ پھر اسے اپنی آواز سنائی دی تھی۔

اس نے گلے میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارا۔

دلہن کی بہن کی بھوری آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ یوں جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ یوں جیسے پہلی بار مل رہی ہو۔

سرخ ڈوروں میں کرب تھا مگر آنکھیں بے طرح سے خشک تھیں۔ جیسے ان میں نمی کا ایک ذرہ بھی موجود نہ ہو۔

دولہا کی بے چینی میں کچھ اضافہ ہوا۔ اس نے نگاہ ہٹالی۔ دلہن کی بہن بھی اسے یکسر نظر انداز کیے اس کی ماں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

دولہا اب مسکرا رہا تھا۔ اپنے ہونے والے سسر کے کسی سوال کا جواب بھی دے رہا تھا۔ مشروبات سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ قہوہ بھی پی رہا تھا۔ مٹھائی بھی چکھ رہا تھا مگر اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس کا گمان کہیں اور تھا۔ خیال کہیں اور تھا۔

بے دھیانی میں، بے خیالی میں، وہ سوچے جا رہا تھا تو بس یہی۔

وادی برکان میں اسے محبت ہوئی بھی تو کس سے؟ نورسین کی سگی بہن سے؟

سات سال کی طویل مدت کے بعد اس نے چنا بھی تو کسے؟ نورسین کی سگی بہن کو؟

یہ اتفاق تھا تو کیسا عجب اتفاق تھا۔

کچھ دیر تک وہ اپنے آپ سے الجھتا رہا، اپنے اندر لگی کسی آگ میں انگارے کی طرح سلگتا رہا پھر وہ معذرت چاہتے ہوئے اٹھا اور مجلس سے ملحقہ دروازے سے باہر صحن میں آ گیا۔ کھلی فضا میں گہری سانس لیتے اس نے بے اختیار سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔

نورسین کو دیکھ کر اسے جھٹکا کیوں لگا تھا؟ اس کا سانس کیوں رکا تھا؟ زمین میں گڑ جانے کا جی کیوں چاہا تھا؟

ہواؤں میں یکا یک روانی آ گئی۔ نیلگوں آسمان پر بکھرے، کچھ سفید، کچھ بھورے بادلوں کا ملاپ ہونے لگا۔ آفتاب بادلوں کی اوٹ میں پوشیدہ ہوا تو اس کی زرکار کرنیں زمین سے دور بہت دور ہونے لگیں۔

اور وہ دیکھتا رہا۔

وہ گھنے سیاہ بادلوں کو آسمان پر پھیلتا دیکھتا رہا۔

اور ذہن کو پیچیدہ خیالات کی گرفت سے چھڑاتا رہا۔

☆☆☆

رسم خطوبہ (منگنی کی رسم) اور رسم نکاح کے بعد اس وقت سب مہمان طعام گاہ میں موجود تھے جہاں شام کا کھانا بڑی رغبت سے تناول فرمایا جا رہا تھا۔ ہلکی پھلکی گفتگو بھی جاری تھی۔ عزیز و اقارب، دوست

www.pdf.pklibrary.com

واحباب اور پڑوسی سب دعوت پر مدعو تھے اور خوشی کے اس موقع پر دل سے شریک ہوئے تھے۔ گھر کی خوشیاں دوبالا ہوگئی تھیں۔ سب کچھ مکمل سا نظر آرہا تھا۔

وہ اس وقت خواتین کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کے بعد بارش کا جائزہ لینے کے لیے صحن کے دروازے میں آکھڑی ہوئی تھی۔

بارش ہلکی ہلکی پھوار کی صورت میں برس رہی تھی۔ شمع دانوں کی مدھم روشنی میں صحن اور اطراف میں بکھرا سبزہ زار مکمل طور پر بھیگا ہوا تھا۔

پتھروں کی وہ روش جس کے اوپر مکان سے لے کر بیرونی دروازے تک شہتیر کی کڑیوں سے تین فٹ چوڑی چھت بنائی گئی تھی وہ بھی پانی سے نم تھی۔

عین اسی لمحے بیرونی دروازے کی کنڈی شدت سے کھڑکائی گئی۔

جو کنڈی کھڑکائی جارہی تھی وہ کسی عورت کی موجودگی کا پتا دے رہی تھی۔ شہر بغداد کی طرح یہ رسم و رواج ان کے یہاں بھی رائج تھا۔ دروازے پر دو طرح کی کنڈیاں لگائی جاتی تھیں۔ ایک مرد کے لیے۔ ایک عورت کے لیے۔ تاکہ جب بھی کوئی دروازہ کھٹکھٹائے اہل خانہ کو معلوم ہو جائے کہ دروازے پر کون ہے۔ باہر مرد ہوتو گھر کا مرد دروازہ کھولنے جاتا تھا۔ عورت ہوتی تو گھر کی عورت ہی دروازے پر جاتی۔

ملازم اندر مصروف تھے، آس پاس کوئی ملازمہ بھی نہ تھی جسے وہ دروازے پر بھیج دیتی۔ تب ہی وہ لباس کا دامن ٹخنوں تک اوپر اٹھائے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

جتنے مہمان مدعو تھے، وہ آچکے تھے۔ جانے وہ کون تھی جو نہ صرف تاخیر سے آئی تھی بلکہ بے صبری سے دروازے پر دستک بھی دے رہی تھی۔

ملازمہ نور سین کی تلاش میں صحن میں داخل ہوئی تو اسے دروازے کی جانب بڑھتا دیکھ کر خود بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔

"کون ہے دروازے پر؟" نور سین نے بلند آواز پوچھا تھا۔

دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ بارش کے شور کے باعث اس کی آواز یقیناً باہر نہ گئی تھی اور لازماً چلی بھی جاتی اگر جو دستک دینے والا تین بار دستک دے کر کھلنے کا انتظار کرلیتا۔

اس نے کنڈی اتاری اور لکڑی کے بھاری مضبوط دروازے کو ذرا سا اپنی جانب کھینچا۔

دروازے کی محراب کے ساتھ لگی شمع دان کی روشنی میں چہرہ واضح ہوا۔

بھیگے بال، بھیگا چہرہ، بھیگے کپڑے۔ ایک ہاتھ میں گھوڑے کی باگ تھامے دوسرے ہاتھ کو دستک کے لیے آگے کیے وہ ایک ہی جگہ رک سا گیا تھا۔

مرد تھا وہ تو کنڈی عورتوں کی کیوں کھڑکائی؟

نور سین کے چہرے پر ناگواری در آئی۔

"کیا چاہیے؟" اس نے لب بھینچ کر سرد لہجے میں پوچھا۔ یہ شادی کا گھر تھا۔ آج شب وہ اپنے مہمان خانے میں معمول کے مطابق کسی مسافر کو نہ ٹھہرا سکتے تھے۔

"کیا یہ تاجر امجاد فتحی کا گھر ہے؟" سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

"دستک دینے والے کو معلوم ہونا چاہیے وہ کس دروازے پر دستک دے رہا ہے۔" اس نے دروازہ بند کرنا چاہا۔

گھڑ سوار نے چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر دروازہ بند کرنے سے روک دیا۔

نور سین نے سر اٹھایا۔

"دیکھیں، یہ شادی کا گھر ہے، آج ہم کسی مسافر کو اپنے گھر پناہ نہیں دے سکتے۔" اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"میں جاسم عنزی کا بھتیجا ہوں' آدم بن مراد۔"

نور سین کا دروازے کو اپنی جانب کھینچتا ہاتھ رک گیا۔

"میرے خیال سے رسم خطوبہ، رسم نکاح اسی حویلی میں سرانجام پانا ہے۔" اس نے مزید کہا۔

www.pdf.pklibrary.com

"رسم خطوبہ اور رسم نکاح تو کب کا سرانجام پا چکے۔" نورسین نے سرد مہری سے اطلاع دی۔

وہ چپ سا ہو گیا۔

(اتنا قریبی رشتہ دار اور وقت پر پہنچ کر خوشیوں میں شریک بھی نہ ہو سکا۔ اونہہ)

"کیا آپ کو کسی نے آگاہ نہیں کیا کہ مرد کو دروازے پر یہ والی کنڈی کھڑکانی ہوتی ہے؟" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اسے ناراضی دکھائی۔

"میں ایک گنوار اور بدتہذیب انسان ہوں، اس کے لیے معذرت۔" اس دفعہ اس نے بھی سرد مہری سے جواب دیا تھا۔

وہ بارش میں بھیگ رہا تھا، سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ لڑکی اندر داخل ہونے کا راستہ نہ دے رہی تھی، لہجے میں نرمی کہاں سے آتی؟

نورسین نے دروازہ کھول دیا تاکہ گنوار اور بدتہذیب انسان اندر داخل ہو سکے۔

ملازمہ نے عجلت سے گھوڑے کی باگ تھامی اور اسے کھینچتے ہوئے اصطبل میں لے جانے لگی۔ جبکہ وہ نورسین کے ساتھ گھر کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

مرکزی دروازے تک دونوں کے مابین خاموشی رہی۔ مگر جب دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہونے لگے تو نورسین نے اس بدتہذیب انسان کو ایک بار پھر یاد دلایا کہ وہ اپنے جوتے دروازے میں ہی اتار دے۔

"اس کا مجھے علم تھا۔" اس نے گھٹنوں تک چڑھائے چمڑے کے لمبے جوتوں کو اتارتے ہوئے نورسین سے کہا۔

گھر کی روشنی میں اس کا چہرہ اب زیادہ واضح ہوا تھا۔

عنبریں رنگ کی تیکھی گہری آنکھوں پر ہلکے شہد رنگ کے بھیگے بال۔ جن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ہلکی سی تراشیدہ داڑھی جو اس کے چہرے پر کافی جچ رہی تھی۔

"مجلس کس طرف ہے؟" وہ اب پوچھ رہا تھا۔

نورسین اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کیا وہ اس طرح، اس حالت میں مہمانوں کے سامنے آئے گا؟ بھیگا ہوا، کیچڑ سے لت پت کپڑوں کے ساتھ؟ کیا اسے اپنے رشتے داروں کے احساسات کا ذرا بھی خیال نہیں؟

ایک تو وہ تاخیر سے آیا ہے۔ اوپر سے حلیہ بھی ایسا ہے کہ والدہ تو کسی بھی صورت مجلس کی بیش قیمت صاف ستھری نشستوں پر نہ بیٹھنے دیں گی۔ اور خود اس کے اپنے رشتہ دار۔۔۔ اس کے رشتہ دار کیا سوچیں گے؟ کیا توجیح پیش کریں گے؟

"آپ کو اس حالت میں دیکھ کر آپ کے چچا کو کتنی سبکی اٹھانا پڑے گی؟" کچھ سوچ کر اس نے ادھم بن مراد کو شرم دلانے کی کوشش کی تھی۔

"سبکی کیوں اٹھانا پڑے گی؟" آنکھوں میں حیرت لیے اس نے نورسین کو دیکھا۔ "کیا آسمان میری سنتا ہے؟ میری مانتا ہے؟ کیا وہ میری وجہ سے برستا ہے؟"

وہ اس کے برجستہ جواب پر دنگ رہ گئی۔

"مجلس کس طرف ہے؟" گھر کا جائزہ لیتے ہوئے وہ خود بھی یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجلس کس طرف ہو سکتی ہے۔

اتنے میں ملازمہ واپس آ گئی۔

نورسین نے گہری سانس لے کر مہمان خانے کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔

"آپ اپنا حلیہ درست کیجیے پھر آپ کی مجلس کی طرف رہنمائی کی جائے گی۔" وہ ہاتھ سے اسے مہمان خانے میں داخل ہونے کا راستہ دکھا رہی تھی۔

ادھم کی چوڑی پیشانی پر بل پڑ گئے، گہری تیکھی آنکھیں ناگواری سے سکڑ گئیں، ٹھنڈے یخ بستہ ہاتھ مزید ٹھنڈے ہو گئے۔

"دیکھیں، میرے پاس اتنا فضول وقت نہیں کہ میں تقریب میں شرکت کے لیے ساری رات بیٹھا رہوں۔ میں اندر جا کر سلام کروں گا، مبارک باد دوں گا اور واپس چلا آؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں مجلس

www.pdfpklibrary.com

کے کسی حصے پر کیچڑ یا مٹی کا کوئی نشان نہ ٹھہرے گا۔"

نورسین اس کی سنی، ان سنی کیے ملازمہ کو ہدایت دینے لگی کہ وہ جلد از جلد مہمان کو گرم لباس فراہم کر دے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ وہ اسے قہوہ اور پینے کے لیے نیم گرم پانی بھی عطا کرے اور جب یہ سارے کام بخیر و عافیت سرانجام پا جائیں تو ہی مہمان کو مجلس کا راستہ دکھایا جائے۔

ادھم نے اسے لب بھینچ کر دیکھا۔

"مہمان کو اپنی عزت کا خیال نہ ہو تو میزبان کو ضرور خیال کرنا چاہیے۔"

وہ چلی گئی اور ادھم بن مراد لب بھینچے مہمان خانے کے دروازے میں ساکت کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

نئے مہمان کی آمد پر۔ مجلس میں براجمان کچھ افراد کے چہروں کے تاثرات بدلے تھے۔ ان میں سرفہرست عنزی صاحب تھے جنہیں ادھم بن مراد کی آمد کی ہرگز توقع نہ تھی۔ وہ توقع کرتے بھی تو کیوں؟ کس لیے؟ کچھ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی اور کچھ وہ خاندانی محفلوں میں شرکت بھی نہ کرتا تھا۔ اور پھر ان کے مابین اختلاف اس نوعیت کے چل رہے تھے کہ گزشتہ چند ماہ سے بات چیت کا سلسلہ کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے جان بوجھ کر دعوت نامہ بھی کل رات کو ہی بھجوایا تھا۔ تاکہ اسے خبر بھی ہو جائے۔ اور وہ آ بھی نہ سکے۔

اس کے باوجود۔ تاخیر سے ہی سہی، وہ رسم نکاح میں شرکت کے لیے آ گیا تھا۔ حالانکہ اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ عنزی صاحب کا، ان کی زوجہ کا، ان کے اکلوتے بیٹے اور ان کے کچھ قریبی رشتہ داروں کا خیال تھا اور یہ خیال درست بھی تھا۔ وہ آتا بھی تو کیوں؟ کس لیے؟

سلام دعا کے دوران واقفیت کی ضرورت محسوس ہوئی تو عنزی صاحب کو اپنے چہرے کے تاثرات نرمی میں ڈھالتے ہوئے اس کا تعارف کروانا پڑا۔

"ادھم بن مراد۔ میرے مرحوم بھائی کا اکلوتا بیٹا!"

نورسین نے ملازمہ کو مشروب پیش کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے بے اختیار سر اٹھا کر اسے ہی دیکھا تھا۔ وہ جو بیزاری سے حاضرین کا جائزہ لیتا کچھ بے چین سا لگ رہا تھا۔ اس کے ہر انداز سے ظاہر تھا اسے جانے کی جلدی ہے۔

جو بات ادھم بن مراد سے شروع ہوئی تھی وہ اس کے مرحوم والد اور اس کے والد سے پھر ان کے خودساختہ کاروبار کی طرف مڑ گئی تھی۔

عنزی صاحب کے برابر میں بیٹھے ادھم نے بیزاری سے پہلو بدلا تھا۔

"مراد کو کاروبار کے لیے پیسا چاہیے تھا۔" عنزی صاحب اب کہہ رہے تھے۔ "سرمایہ اسے میں نے فراہم کیا تھا۔ بے شک کاروبار اس نے شروع کیا مگر اس میں جو رقم خرچ ہوئی ہے، وہ اس نے مجھ سے قرض لی تھی۔ وہ قرض ادا کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔"

بات گھوم پھر کر واپس عنزی صاحب کے اپنے کاروبار کی طرف آ گئی تھی۔ اور وہ ایک بار پھر شہر بریدہ میں اپنے کارخانوں، دکانوں اور ان عمارتوں کا ذکر کرنے لگے تھے جو بقول ان کے، انہوں نے اپنے خون پسینہ کی کمائی سے گزشتہ پندرہ سالوں میں تعمیر کی تھیں۔ حاضرین انہیں سن رہے تھے، ان کی محنت کو سراہ رہے تھے، ان کی لگن، ہمت اور حوصلے کو داد دے رہے تھے۔ صفر سے شروع ہو کر شہر بریدہ کے نامور تجار کی فہرست میں اپنا نام لکھوانا کوئی چھوٹی بات تو نہ تھی۔ کوئی چھوٹا کام تو نہ تھا اور پھر وہ تھے بھی اتنے محنتی، سخی اور رحم دل انسان جس کی گواہی پورا شہر دیتا تھا۔

گفتگو کے دوران ملازمہ نے ادھم کو مشروب پیش کیا تو اس نے ظرف لے کر میز پر رکھ دیا۔ اپنے اطراف سے یکسر بے نیاز ہو کر قہوہ پیا اور کچھ دیر بعد

www.pdf.pklibrary.com

اہل مجلس سے اجازت چاہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

میزبان نے طعام کی پیشکش کی تو اس نے پیشکش رد کرتے ہوئے معذرت چاہی۔ اصرار بڑھا تو اس نے نورسین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس کے والد کو تسلی دی کہ اسے مہمان خانے میں کھانا پیش کر دیا گیا تھا۔

نورسین اپنی جگہ دم بخود رہ گئی۔ کھانا کب پیش کیا گیا تھا اسے؟

یہ شخص جتنا بدتہذیب تھا اتنا کاذب بھی تھا۔

نورسین کو وہ ایک آنکھ نہ بھایا۔

سب سے مشترکہ سلام کر کے جب وہ باہر گیا تو عنزی صاحب بھی اس کے پیچھے آ گئے۔

"پتا درخت سے جدا ہو جائے تو وہ اپنی شان کھو دیتا ہے، پہلے اس کا رنگ بدلتا ہے، پھر اس کی قوت سلب ہوتی ہے، اس کے بعد وہ قدموں تلے روندا جاتا ہے۔ اس کا یہی مقدر ہے۔"

ادھم نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔

"زمانے کی ٹھوکروں نے تمہیں یہ بات اچھی طرح سے سمجھا دی ہو گی۔"

"بہت اچھی طرح سے۔" مختصر جواب دے کر اس نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔

گہری سوچ میں ڈوبی ان آنکھوں میں اک کرب تھا۔ نفرت، حقارت اور غصے کا تاثر لیے ایسا کرب جو سرخ ڈوروں پر ابھرتی نمی میں مدغم ہو رہا تھا۔

"مجھے عبداللہ سے معلوم ہوا کہ تم نعیم آفندی کے ریستوران میں بیرے کی حیثیت سے کام کر رہے ہو۔ تمہارا تو مجھے اندازہ نہیں کیوں کہ تم بے حس ہو چکے ہو مگر مجھے تمہیں اس طرح دوسروں کی نوکری چاکری کرتا دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔"

وہ خاموش رہا۔

"صد شکر کہ میرے کاروباری دوست جانتے ہیں تم کس طرح کے نوجوان ہو ورنہ تمہاری اس حالت کا ذمہ دار بھی مجھے ہی ٹھہرا لیا جاتا۔"

ادھم نے لب بھینچ لیے۔ نگاہیں ہنوز جھکی رہیں۔ وہ اپنے چچا کے قدموں کو دیکھ رہا تھا۔ نہیں شاید وہ ان قدموں کے نیچے اس زمین کو دیکھ رہا تھا جو اس پر تنگ ہو رہی تھی۔

"تم جب واپس آنا چاہو آ سکتے ہو۔ میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔" عنزی صاحب نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"وہ گھر صرف آپ کا کب سے ہو گیا؟"

سوال غیر متوقع تھا۔ وہ حیران رہ گئے تھے۔

"میں اگر آپ کے نزدیک درخت کا ایک ادنیٰ سا پتا ہوں تو پتا ہی سہی۔ ٹوٹ گیا، گر گیا، بکھر گیا، مٹ گیا۔ شکر ہے میں وہ پیڑ نہیں جسے اپنی قد و قامت، پختگی اور استحکام پر اتنا گھمنڈ ہوتا ہے کہ وہ جھکتا ہی نہیں۔ جو پیڑ جھکتے نہیں ہیں چچا جان تقدیر کی آندھی انہیں کاٹ دیتی ہے۔"

عنزی صاحب سانس نہ لے سکے تھے۔ اتنی بڑی بات۔ ادھم بن مراد نے کر بھی کیسے لی تھی؟ اتنی گہری بات۔ اس نے سوچ بھی کیسے لی تھی؟

"خدا حافظ۔" وہ انہیں ہکا بکا چھوڑے جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔

"تم یہاں آئے کس لیے تھے؟ یہ بکواس کرنے؟" صدمہ کچھ کم ہوا تو وہ غصے سے بپھرے چلائے تھے۔

ادھم راہداری سے ہوتا ہوا مرکزی دروازے کی جانب تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

"احسان فراموش۔" مرکزی دروازے کے قریب انہوں نے اسے کندھے سے پکڑ کر، اس کا رخ اپنی جانب موڑا تھا۔

"تمہیں پال پوس کر بڑا کیا، تربیت کی، تعلیم دلوائی، گھر بار، عزت، دولت کس چیز کی کمی ہونے دی میں نے تمہیں؟ اور تم مجھے اس کا یہ صلہ دے رہے ہو؟" انہوں نے دبی آواز میں اسے جھڑکا تھا۔

ادھم نے تحمل سے اپنا کندھا چھڑا لیا۔

"کیا اس میں میرا قصور ہے کہ جاسم نے اس

www.pdf.pklibrary.com

دن تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا؟"

انہوں نے ایک بار پھر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ ایک ایک غلطی، ایک ایک گناہ، ایک ایک جرم کا حساب تھا ان کے پاس۔ وہ نہ بھولتے تھے اور نہ ہی درگزر کرتے تھے۔ نہ ہی معاف......

"کچھ معلوم بھی ہے تمہیں کہ اگر میں اس لمحے مداخلت نہ کرتا تو آفندی صاحب تمہارا کیا حشر کرتے؟"

ادھم کی آنکھوں کی نمی یکا یک گہری ہوئی۔ اتنی گہری کہ اگر وہ پلکیں جھپکا کر رخ نہ بدلتا تو ابھی گھر کے درودیوار اس کی روح کے ہزار ہا ٹکڑے ہوتا دیکھ لیتے۔ آوازیں تو وہ سن ہی رہے تھے۔

"اس کے باوجود اپنی زہریلی زبان کے جوہر تم مجھے دکھا رہے ہو؟ مجھے سنا رہے ہو؟ بھول گئے میں نے آفندی صاحب کے سامنے تمہاری زندگی کے لیے کیسے سر جھکایا تھا۔ اس دو ٹکے کے انسان کے مطالبات کیسے تسلیم کیے تھے؟"

"میں کچھ بھی بھولا نہیں چچا جان۔" اس نے صبر کا گھونٹ بھر کر تحمل سے جواب دیا۔ "اور اللہ بھی نہیں بھولا۔"

عزی صاحب یک دم ساکت ہوئے۔ پتھر کی طرح۔ تیزی سے چلتی زبان گنگ ہوئی تھی اور دماغ ماؤف، خالی۔ کوئی وجہ کوئی دلیل، کوئی حجت۔ اس میں نہ سمائی تھی۔

کیا تھا ان لفظوں میں؟ کوئی دھمکی، کوئی تنبیہہ، کوئی للکار؟؟ نہیں! فقط لفظ "اللہ" ہی تو گفتگو میں مستعمل ہوا تھا۔ ہاں مگر پہلی بار ہوا تھا۔ پہلی بار ادھم بن مراد اپنے کسی معاملے میں "اللہ" کو لایا تھا۔ پہلی بار وہ تنہا نہیں تھا، وہ اپنے ساتھ کسی طاقت کو لایا تھا۔

'اللہ نہیں بھولتا' یہ بات وہ بھول گئے تھے۔ اور اب جب ادھم نے یاد دلا دی تھی تو وہ اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی اور بے سکونی محسوس کر رہے تھے۔ حالانکہ انہیں کوئی خوف نہ تھا، کوئی فکر نہ تھی، کوئی پریشانی نہ تھی۔ پھر بھی۔ نہ جانے کیوں۔ قرار نے ساتھ چھوڑا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں۔ پکار نے ساز توڑا تھا۔

مگر ضمیر کے مقابلے میں ان کا نفس زیادہ جری، زیادہ قوی، زیادہ شجاع تھا۔ وہ ان کے وجود کو تھپکیاں دیتے ہوئے کہہ رہا تھا "حصل خیر! حصل خیر۔"

اور وہ اسے خاموشی سے سن رہے تھے۔ بلکہ "اس کی" سن رہے تھے۔ ادھم جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔

ادھم شدت سے برستی بارش میں بھیگتے ہوئے اصطبل کی طرف جانے لگا تھا۔

"حصل خیر۔" انہوں نے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

ادھم نے اپنے گھوڑے کی باگ تھامی تھی اور اپنا رخ بیرونی دروازے کی جانب موڑ لیا تھا۔

دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ بارش میں مکمل بھیگ چکا تھا۔

لباس بدلنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا تھا، کپڑے ایک بار پھر بھیگ گئے تھے۔ اس نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

نورسین نے اپنے کمرے کی کھڑکیوں پر بھاری پردے پھیلا دیے۔ بیرونی دروازہ بند ہوا تو عزی صاحب بھی پلٹ گئے۔

شمع دانوں میں جلتے دیے، گیت، نغمے، افراح کا رقص، ہنسی، قہقہے، مسکراہٹیں بارش سے یکسر بے نیاز اپنے دائرے میں گھومتی رہیں۔ اور سراب کی تمازت سے سلگتے قلب ساری رات جلتے رہے۔ جلتے رہے۔ جلتے رہے......

☆☆☆

زندگی میں ایک داغ۔ ایک زخم۔ ایک نشان چھوڑے سندس اس گھر سے رخصت ہو کر جا چکی تھی۔ طلوع آفتاب تک اپنے آپ کو چٹانوں کی طرح مضبوط کیے نورسین ذہن کو ماضی کے دھندلکوں

www.pdf.pklibrary.com

سے صاف کرتی رہی اور جب تھک گئی تو علی الصبح ایک ہاتھ سے لباس کا دامن مضبوطی سے پکڑے۔ دوسرے ہاتھ میں خطوط کا پلندہ تھامے پتھریلے راستوں، گھاٹیوں اور سرخ پھولوں والی پگڈنڈیوں سے ہوتی ہوئی جھیل کی طرف آگئی تھی۔

گزشتہ شب بارش کی وجہ سے۔ قدرت کی ہر شے نکھری سی گئی تھی۔ روئی تو وہ بھی تھی۔ اندر ہی اندر۔ مینہ تو اس کے دل پہ بھی برسا تھا مگر نہ جانے کیوں روح بوجھل سی تھی۔ نا جانے کیوں دل بے قرار سا تھا۔

اس نے رک کر، سر اٹھا کر نیلگوں آسمان پر سفید پرندوں کو اونچی اڑان بھرتے دیکھا اور پھر سوچ میں پڑ گئی کہ وہ برکان کے جنگل میں یوں۔ صبح سویرے۔ بغیر کسی قصد۔ بغیر کسی غرض کے کیوں آ گئی۔

اسے یاد آیا کہ اس کے ہاتھوں میں محمود عنزی کے خطوط کا پلندہ ہے۔ جن میں اظہار محبت کے کھوکھلے جملے ہیں۔ جھوٹی امیدیں، جھوٹی قسمیں، جھوٹے وعدوں کے کھلونے ہیں۔

وہ برکان کے جنگل میں ایک بار پھر اپنی زندگی کے معنی ڈھونڈنے آئی تھی۔ وہ مقصد جو کھو گیا تھا اسے کھوجنے آئی تھی۔ محبت کے جس بت کو اس نے اپنے ہاتھوں سے توڑا تھا آج وہ اس کے ٹکڑے یہیں کہیں۔ گہرائیوں میں دفنانے آئی تھی۔ گزرے ماہ و سال کی نشانیوں کو۔ اپنے ہاتھوں سے مٹانے آئی تھی۔

کہیں کوئی ثبوت نہ رہے کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ بے وقوف بنایا گیا ہے۔ کہیں کوئی نشانی نہ رہے کہ اس کے احساسات سے کھیلا گیا ہے۔ اسے ٹھکرایا گیا ہے۔

کہیں کوئی دلیل نہ رہے کہ محبت کے نام پر وہ بہت بری طرح سے ہاری ہے۔

کسی کو کچھ معلوم نہ ہو۔ کبھی معلوم نہ ہو۔

ماضی مٹ جائے۔ یادداشت سے محو ہو جائے۔

گہرا سانس لے کر اس نے خطوط کا پلندہ پتھر پر رکھ دیا۔

جھیل کا شفاف پانی ایک لمحے کے لیے جیسے اس کے لیے رکا تھا۔

”میں شاید خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں کہ ان لفظوں سے جان چھڑانے کے لیے میں نے تمہارا انتخاب کیا۔“ وہ اپنی شبیہ کو تکتے ہوئے ہولے سے بولی۔

”تم میرے دوست ہو، تم لفظوں کو خود میں ضم کر لو گے، نہ تمہارا رنگ بدلے گا، نہ تمہاری خوب صورتی میں کمی آئے گی۔“ خطوط کا پلندہ کھولتے وہ کنارے بیٹھ گئی۔

”میری رسائی محض صفحوں تک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”صفحوں پر منقش لفظوں تک ہے، تمہاری یادداشت کے صفحے کبھی کورے نہ ہوں گے، وہاں جو لکھا ہے اسے دوام حاصل ہے۔“

نورسین کرب کے عالم میں خطوط کھول کھول کر جھیل کے حوالے کرنے لگی۔

لفظ اپنا وجود کھو رہے تھے۔ وہ مٹ رہے تھے۔ مگر جو بے قراری تھی وہ کسی صورت کم ہونے میں نہ آئی تھی۔

مگر جو درد تھا وہ کسی صورت ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

☆☆☆

سات سال ایک طویل مدت تھی۔ ایک طویل عرصہ۔ سب بھلا دینا سہل نہ تھا۔ سب یاد رکھنا بھی آسان نہ تھا۔ گزرے پل یاد بن کر اسے دکھی، مضطرب اور سوختہ کرتے رہتے تھے۔ اسے ہر بات اذیت میں گرفتار کرتی تھی۔ ہر خیال وحشت میں مبتلا کرتا تھا۔

وہ خطوط سے چھٹکارا پا چکی تھی۔ محمود عنزی کو بھی اپنی زندگی سے نکال چکی تھی مگر پھر بھی کچھ تھا جو اسے رنج اور کدورت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ کچھ تھا جو اسے وحشت اور بے بسی کے دہانے پر بٹھا دیتا تھا۔

www.pdf.pklibrary.com

زخموں کو بھرنے کے لیے وقت چاہیے۔ اسے بھی وقت درکار تھا۔ مگر اس کا "وقت" تھا کہ گزر ہی نہ رہا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا کر ہی نہ رہا تھا۔ اس کی ساعتیں تھم گئی تھیں۔ احساسات پر جمود طاری ہو گیا تھا۔

گو کہ اس نے بند آنکھوں سے خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیے تھے۔ مگر جھوٹ، دھوکے اور فریب کی جو اذیت تھی وہ اسے پل پل مارتی تھی۔

اس صورت میں وہ سنبھلتی بھی تو کیسے؟ کس طرح؟ یہ سب آسان نہ تھا۔ ہرگز آسان نہ تھا۔

اس کے باوجود وہ لڑ رہی تھی۔ ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس نے خود کو اس حد تک مضبوط کر لیا تھا کہ دل و دماغ کے نہاں خانوں میں اذیت بھری چیخ و پکار کا اثر اس کے چہرے سے عیاں نہ ہوتا تھا۔

یہ اس کا خیال تھا کہ اس کا "ظاہر" مستحکم ہے جس پر اس کا "باطن" کسی بھی صورت اثر انداز نہیں ہوتا مگر اس معاملے میں بلقیس کی رائے مختلف تھی۔

گزشتہ شب جب وہ اس سے ملنے آئی تھی تو اس نے کہا تھا۔

"نورسین! اگر "باطن" مضبوط نہ ہو تو "ظاہر" پتوں کی طرح بکھر جاتا ہے۔ "غم" اور "حزن" میں بھی تو فرق ہوتا ہے۔ "غم" صرف دل میں مقید رہتا ہے۔ حزن چہرے سے عیاں ہوتا ہے۔ تم نے اپنے حزن کو "غم" میں بدل دیا ہے۔ تم نے اسے دل میں مقید کر لیا ہے۔"

"مگر میری آنکھیں اب بھی میرا ہر راز افشاں کر دیتی ہیں۔" اس نے جرح کی تھی۔

"تمہاری آنکھیں اتنی تاریک اور گہری ہو گئی ہیں کہ کوئی ان میں غرق تو ہو سکتا ہے مگر کوئی سر (راز) نہیں پا سکتا۔"

ایک صبر آزما کوشش کے بعد اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ بیت چکا ہے اس پر صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

مگر اس کے ساتھ ایک بار پھر انہونی ہو گئی تھی۔ ایک بار پھر کچھ ایسا ہوا تھا جس نے روانی سے بہتے دریائے زندگی کا رخ موڑ دیا تھا۔ کچھ ایسا جس نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

بہار کے دن تھے، وہ بلقیس کے ساتھ برکان کے جنگل میں چہل قدمی کے بعد گھر پہنچی تو اس نے سندس کے سسر کو گھر سے نکلتے دیکھا۔ والد انہیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئے ہوئے تھے۔

پچھلے کچھ ہفتوں سے عزری صاحب کے چکر ان کے یہاں زیادہ ہی لگ رہے تھے۔

دونوں کے مابین ابھی بھی کسی بات پر گفتگو چل رہی تھی۔ قریب پہنچ کر اس نے سلام کیا تو عزری صاحب نے نرمی سے دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور دعا دی۔

وہ ان سے مل کر اندر چلی گئی۔

والد جب واپس آئے تو کچھ دیر تک مجلس میں والدہ سے مدھم آواز میں گفتگو کرتے رہے اور جب ان کی بات ہو چکی اور وہ کام کے سلسلے میں جا چکے تو والدہ نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے؟" اس نے داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"بیٹھو۔"

وہ بیٹھ گئی۔

"عزری صاحب رشتے کے لیے آئے تھے۔" چند ثانیوں کے بعد انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"کس کے رشتے کے لیے؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"اپنے بھتیجے ادھم بن مراد کے لیے انہوں نے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔"

اور نورسین کو لگا جیسے کسی نے اس پر برکان کے سمندر کا ٹھنڈا پانی انڈیل دیا ہو۔

"بہت اچھا اور سلجھا ہوا نوجوان ہے، تمہارے والد اس سے مل چکے ہیں۔ عزری صاحب کے

www.pdf-pklibrary.com

کاروبار میں ان کا شریک ہے۔ اپنے چچا زاد کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اچھا گھر ہے، اچھا خاندان ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ لوگ خود بھی بہت اچھے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں، سندس کتنا خوش رہ رہی ہے۔ اس گھر میں وہ ملکہ جیسی زندگی بسر کر رہی ہے۔"

ایک لمحے کو رک کر انہوں نے نورسین کو دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت، وحشت اور بے یقینی کے کئی رنگ بکھرے تھے مگر ماں کو کوئی ایک رنگ بھی نظر نہ آیا تھا۔ وہ خوش تھیں۔ بھلا کیوں نہ خوش ہوتیں؟ عنزی خاندان کا حصہ بننا کوئی معمولی بات تو نہ تھی اور پھر ان کی دونوں بیٹیوں کے رشتے اس خاندان سے آئے تھے تو وہ کیوں نہ اطراف سے یکسر بے نیاز ہوتیں؟ کیوں نہ مسرور ہوتیں؟ محظوظ ہوتیں؟ انہیں ٹوٹے دل کی کرچیاں کہاں نظر آتی تھیں؟ انہیں ساکت لبوں میں دبی چیخیں کہاں سنائی دیتی تھیں؟

"تمہارے والد اس رشتے سے راضی ہیں۔ میرا دل بھی مطمئن ہے، مگر ہم دونوں تمہاری رائے جاننا چاہتے ہیں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو کیا ہم انہیں کل بلا لیں؟"

نورسین دم سادھے ماں کو دیکھنے لگی۔ ان کی آواز گم ہو گئی تھی، سنائی نہیں دے رہی تھی، ان کے لب ہل رہے تھے، وہ مسکراتے ہوئے نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ کیا کیا بتا رہی تھیں مگر اس کی سماعت کام کرنا چھوڑ چکی تھی۔

کیا ایسا بھی ممکن ہے؟ اگر ہاں تو کیوں؟ کس لیے؟ اگر یہ تقدیر کا کوئی کھیل ہے تو یہ کیسا کھیل ہے؟ اگر یہ قسمت کی کوئی چال ہے تو یہ کیسی چال ہے؟ ہر صورت دکھ اور کرب ہی کیوں اس کا مقدر بنے؟ ہر زاویے میں وہ ہی کیوں کھیل اور تماشا دیکھے؟

زندگی بھی تو کتنی عجیب ہوتی ہے۔ ایسے ایسے حل تجویز کرتی ہے جن کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

اس نے تو کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہ اس طرح محمود کے خاندان کا حصہ بن سکتی ہے۔ اس طرح اس کے چچا زاد سے منسوب ہو کر اس کا نصیب بن سکتی ہے۔

محمود عنزی۔ ایک ایسا مرد، جس کے تصور سے ہی غم والم کے پہاڑ اس کے وجود پر ٹوٹنے لگتے ہیں۔ جس کی موجودگی سے ہی آنکھیں گزشتہ ماہ و سال کی تمام حکایتوں کو دہرانے لگتی ہیں۔ وہ حکایتیں جو روح کے ادھڑے ہوئے زخموں پر نمک کا کام دیتی ہیں۔

کیا وہ کسی ایسے انسان کے خاندان کا حصہ بن کر خود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اذیت کی دلدل میں دھنسا سکتی ہے؟

"میں اس رشتے سے راضی نہیں ہوں ماں۔"

تیزی سے ڈوبتے ابھرتے تنفس کے بیچ اس نے بمشکل آواز نکالی تھی۔ لہجے کو ہموار رکھ کر اس نے بڑی اذیت سے فیصلہ سنایا تھا۔

والدہ صدمے سے گنگ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ انہیں فوری انکار کی ہرگز توقع نہ تھی۔ انہیں تو سرے سے "انکار" کی توقع ہی نہ تھی۔

"نورسین! میری بیٹی۔" انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔ کچھ سمجھانا چاہا۔

"میری طرف سے انکار ہے ماں! میری طرف سے انکار ہے۔" وہ یکایک اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور والدہ کو ہکا بکا چھوڑے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

اگلے کئی دن بہت مشکل سے گزرے تھے، اگلی کئی راتیں بہت مشکل سے کٹی تھیں۔ انکار تو اس نے کر ہی دیا تھا مگر والدین کا اصرار بڑھ گیا تھا۔

"سندس کے لیے جب محمود کا رشتہ آیا تھا تو اس نے کیسے اپنے باپ کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا تھا! اس نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اب دیکھو کتنا خوش رہ رہی ہے وہ۔"

اندر کی حکایتوں سے بے خبر والدہ کہتیں۔

انہیں کیا معلوم اقرار و اثبات تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ [illegible] بہت پہلے سے

www.pdf.pklibrary.com

ہو چکے تھے۔

"نورسین! بیٹا اپنے فیصلے پر نظرثانی کرو۔"

اس نے نظرثانی نہ کی، انکار کو انکار ہی رہنے دیا۔ اس نے اپنے والد سے براہ راست بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

مگر اس شب ایک انہونی ہوگئی۔ اس شب سندس بتائے بغیر ہی گھر آگئی تھی۔ نورسین صحن میں چہل قدمی کررہی تھی۔ دروازہ بھی اسی نے کھولا تھا۔

"والدہ کہاں ہیں؟" آتے ساتھ ہی سندس نے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کچھ اچھا تاثر نہ دے رہے تھے۔

"بلقیس کی خالہ کی طرف گئی ہیں، ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" جواب دے کر وہ جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئیں۔

"تو یہ تمہاری نئی چال ہے۔"

آنکھوں میں غیض وغضب کی نمی لیے سندس اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔

حیرت سے رک کر اس نے سر اٹھایا۔ "کیسی چال؟" وہ خاک نہ سمجھی تھی۔

"میرا گھر برباد کرنے کے لیے تم اس حد تک جاسکتی ہو۔ مجھے اس کا قطعی اندازہ نہ تھا۔"

اطراف میں بکھری مجسم خاموشی کے سانچے میں ڈھل کر نورسین صدمے سے گنگ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

"ادھم سے شادی کرکے تم اس گھر میں داخل ہونا چاہتی ہو۔ میری زندگی عذاب بنانا چاہتی ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے محمود کی نظروں کے سامنے رہ کر تم اسے پھر سے اپنا بنالوگی؟"

نورسین کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔

اتنی کریہہ سوچ۔ اتنا گھٹیا الزام! اس کا تنفس یکا یک تیز ہوا تھا۔ اس کی اذیت بڑھی۔

"تم نے کیا سمجھا یہ سب اتنا آسان ہے؟ ہاں؟"

آنکھوں میں سندس کی شبیہ دھندلائی تو اس نے پلکیں جھکائیں۔ اتنی نفرت۔ اتنی کراہت اس کے دل میں آئی کس وجہ سے تھی؟ محض ایک مرد کے لیے؟ مرد بھی ایسا جسے وہ اپنا چکی تھی، جسے اپنا شوہر، اپنا ہم سفر وہ بنا چکی تھی۔ سب کچھ ختم نہیں ہوگیا تھا؟ مٹ نہیں گیا تھا؟ تو اب یہ جو بدلا لیا جارہا تھا یہ کس وجہ سے لیا جارہا تھا؟ اب جو سزا مل رہی تھی وہ کس وجہ سے مل رہی تھی؟

کیا یہ ہوتی ہے محبت؟
رشتے بھلا دینے والی!
بینائی چرا لینے والی!
کیا اسے کہتے ہیں محبت؟
عمر بھر کا ساتھ کہاں گیا؟

محبت، خوشی غم کے لمحے۔ انسیت، فراخ دلی اور رحم دلی کے جذبے کہاں گئے،؟

"اور جس سے تم شادی کرنے کا سوچ رہی ہو جانتی ہو اس کی عزت خاندان میں کیا حیثیت ہے؟" سندس کی بات ختم نہ ہوئی تھی، وہ اس کے بچے کھچے وجود کو پاش پاش کرنے آئی تھی۔

"صفر حیثیت ہے اس کی۔" دانت پیس کر انتہائی حقارت سے بتایا گیا۔ "بلکہ صفر سے بھی کچھ کم۔ ایک گھٹیا آوارہ انسان ہے وہ......اور تم ٹھہریں ادبی ذوق کی مالک۔ اخلاقیات کا درس دینے والی ایک باذوق معلمہ! تمہیں وہ کیسے پسند آگیا؟" لہجہ طنز بھرا تھا، آواز پتھریلی تھی، الفاظ زہریلے۔

"تم اس جیسے انسان سے شادی کرنا کیوں چاہ رہی ہو؟ محمود سے، مجھ سے انتقام لینے کے لیے؟" اس نے کندھوں سے پکڑ کر نورسین کو جھنجوڑا تھا۔

لب سختی سے بھینچے، جلن پیدا کرتی نمی کو آنکھوں میں مقید کیے نورسین نے سندس کے ہاتھ بے رحمی سے جھٹک دیے تھے۔

"نورسین! یہ تم کون سا کھیل کھیل رہی ہو؟ کون سی چال چل رہی ہو؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کس طرح کا مرد ہے تم اس سے شادی کروگی؟"

"ہاں کروں گی...... کروں گی میں اس گھٹیا

www.pdf.pklibrary.com

انسان سے شادی..... تمہارا کیا دخل؟ میری مرضی میں جس سے بھی شادی کروں، جسے بھی اپنا ہم سفر بناؤں، تمہیں کیا مسئلہ؟" وہ سراپا سوال بنی سندس کی نفرت، کدورت اور بدگمانیوں کے سیلاب کے آگے ڈٹ گئی تھی۔

سندس کو اس جواب کی ہرگز توقع نہ تھی، کہ اس تمام عرصے میں نورسین پہلی بار اس پر چلائی تھی۔ پہلی بار اس کی آنکھوں میں پہاڑوں جیسا کچھ ایسا عزم دکھا تھا جس نے سندس کی بنیادیں تک ہلا دی تھیں۔

"تم اسے کوئی چال سمجھو یا کوئی کھیل۔ میں اب شادی کروں گی تو صرف اسی سے۔ صرف اسی سے۔" غیض وغضب کے عالم میں اس نے جو کہا تھا پورے ہوش وحواس میں کہا تھا۔ جو فیصلہ سنایا تھا حتمی لہجے میں سنایا تھا۔ انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ معاملہ عزت نفس اور ہٹ دھرمی کا بن گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اپنی سگی بہن کی وجہ سے اس نے ضد کی سیڑھی پر قدم دھرے تھے، کبھی نہ اترنے کے لیے۔ کبھی نہ پلٹنے کے لیے۔

وہ فیصلہ جو کبھی نہ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

اس لمحے یہ سوچے بغیر کہ وہ صحیح کر رہی ہے یا غلط۔ اس نے ادھم بن مراد سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سزا ہے یہ تو پھر سزا ہی سہی!

"بہت پچھتاؤ گی تم نورا! بہت پچھتاؤ گی۔" سندس پیچھے سے چلائی تھی۔

"مجھے بھی نئے پچھتاوے چاہئیں تاکہ میں پرانے پچھتاوے بھلا سکوں۔" مضبوط لہجے میں اسے سنا کر وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

☆☆☆

نورسین کی رضامندی کے بعد۔ سندس کی ڈھکی چھپی مخالفت کے باوجود وہ رشتہ طے پا گیا تھا۔ رسم خطبہ کے بعد شادی کی تاریخ بھی مقرر دی گئی جو کہ زیادہ دور نہ تھی۔ چونکہ عنزی صاحب کا بیٹا کام کے سلسلے میں کسی دور افتادہ شہر کے دورے پر تھا اور اس کی واپسی اس مہینے کے اختتام پر متوقع تھی اسی لیے عنزی صاحب نے اپنے فرزند کے کاروباری شیڈول کو مدنظر رکھ کر تاریخ مقرر کی تھی۔

سب کچھ بہت جلدی جلدی ہو رہا تھا۔

گو کہ نورسین اپنے فیصلے پر راضی تھی نہ ہی دل سے خوش۔ گو کہ وہ مطمئن تھی نہ ہی پرسکون۔ مگر وہ پھر بھی شادی کی تیاریوں میں اپنی ماں کا ہر طرح سے ساتھ دے رہی تھی، والدہ بھی اس کی پسند ناپسند کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کی من پسند اشیاء کی خریداری کر رہی تھیں۔ سندس نے البتہ خود کو ان معاملات سے الگ کر رکھا تھا۔

اپنی زندگی کی رونقوں سے قطعی بے نیاز وہ اپنی شادی تک کا وقت برکان کے جنگل وادیوں اور گھاٹیوں میں گزارنے لگی تھی۔ زیادہ وقت تنہائی کے سپرد کیے ہر لمحہ سوچ وفکر اور اندیشوں میں گھر کر رہ دیتی تھی۔

وہ خوش نہ تھی مگر اسے ظاہر کرنا پڑتا تھا کہ وہ بے حد خوش ہے۔

وہ مطمئن نہ تھی مگر اسے دکھانا پڑتا تھا کہ وہ مطمئن ہے۔

فیصلہ اس کا اپنا تھا۔ اس کا ذاتی! کسی نے اسے مجبور کیا تھا نہ لاچار! اب پلٹنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی، اگر گنجائش ہوتی بھی تو کیا وہ پلٹ جاتی؟ شادی کو محض دن ہی کتنے رہ گئے تھے؟

شادی کے دن تک ضد کی جن سنگلاخ چٹانوں پر وہ سوار تھی وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگی تھیں، وہ احساسات اور جذبات جو محض اس کے دل تک محدود تھے اب چہرے سے عیاں ہونے لگے تھے۔

رہی سہی کسر محمود عنزی نے پوری کر دی تھی۔ گزشتہ شب جب وہ برکان کے جنگل سے واپس لوٹ رہی تھی تو وہ اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا تھا۔ نورسین نے فوراً سے نگاہ ہٹا کر اپنا راستہ بدلا تھا مگر وہ اپنی ساعتوں کا رخ نہ بدل سکی تھی۔

"ادھم تمہارے لیے غیر مناسب ہے۔"

www.pdf.pklibrary.com

پیغام تھا، تنبیہ تھی، یا خدشہ؟ کیا تھا اس کے لہجے میں؟

"تم اپنے ساتھ بہت غلط کر رہی ہو نورسین۔"

نورسین کی آنکھیں قہر سے سرخ ہو گئیں، مارے خفت، دکھ اور بےبسی کے اس کا دل پھٹنے لگا۔ اس نے مڑ کر اسے نہ دیکھا۔ اس نے خود کو بمشکل کچھ کہنے سے باز رکھا اور پھر اسی متانت اور سنجیدگی سے آگے بڑھ گئی۔

جاتے سمے اور کسی نے دیکھا ہو نہ دیکھا مگر وہ راستہ۔ اس کے اطراف میں بکھرا سبزہ اور درخت گواہ تھے کہ وہ لڑکی بے حسی کے بت سے ٹکرا کر ایک بار پھر پاش پاش ہوئی تھی۔

☆☆☆

جمعہ کی شب وہ ادھم بن مراد کے ہمراہ اپنے گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ بوقت مغرب جب اسے گھوڑا گاڑی میں سوار کیا گیا تھا تو ماں باپ کو الوداعی نگاہوں سے دیکھتے اس نے بڑے کرب کے عالم میں کھڑکی پر پردہ گرایا تھا۔ یکے بعد دیگرے کئی گھوڑے اور گھوڑا گاڑیاں روانہ ہوئی تھیں۔ ادھم بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا مگر پھر کسی نے اسے روک لیا تھا۔

"تم یہیں رکو میں ابھی آتا ہوں۔" جانے سے پہلے اس نے گھوڑابان کو ہدایت دی تھی۔

پھر وہ گھوڑے سے اتر کر کسی شخص سے بات کرنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز دور ہونے لگی تھی جیسے وہ بات کرتے کرتے دور ہوتا چلا جا رہا ہو۔

نورسین بےقراری سے انگلیاں مروڑتی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ کچھ وقت گزرا تو آہٹ سی ہوئی۔ قدموں کی چاپ کے ساتھ اسے گھوڑا گاڑی سے باہر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ آگے کو جھک کر اس نے ذرا سا پردہ سرکایا۔

باہر عنزی صاحب کھڑے تھے۔ وہ گھوڑابان کو جانے کا کہہ رہے تھے۔ نورسین نے سر اٹھا کر پاس کھڑے سفید براق گھوڑے کو دیکھا۔ ادھم ابھی تک نہ آیا تھا۔

گھوڑا گاڑی چلنے لگی تو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ خوف از سر نو اس کے حواسوں پر سوار ہو چکا تھا۔

"بیٹی! فکر مند نہ ہو۔ ادھم بس آتا ہی ہوگا۔" عنزی صاحب نے پردہ ہٹا کر اسے تسلی دی تھی۔

نورسین نے چہرے کے تاثرات سنبھال کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ گھوڑا گاڑی دوڑنے لگی تھی۔ سفر شروع ہو چکا تھا۔ اور نورسین دل ہی دل میں اپنے لیے رب سے دعائے خیر کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

زندگی میں نورسین کو خاموشی نے کبھی اتنا بےچین اور بےقرار نہیں کیا تھا جتنا کہ اس لمحے جب وہ عروسی جوڑے میں ملبوس ادھم بن مراد کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے تھے مگر ان کے مابین ایک فاصلہ تھا۔ ایک حد۔ ایک مسافت۔

ادھم بن مراد۔ اس کا ہمسفر۔ اس کا رفیق حیات۔ جس کے نام اس کی کل کائنات لکھ دی گئی تھی، جس کے ساتھ عمر بھر کی رفاقت عہد وفاء کے نگینوں میں پرو دی گئی تھی۔ وہ جسے محبت کے تمام احساسات اور جذبات کا حق دار ٹھہرا دیا گیا تھا۔

وہ ہمدم۔ وہ ہم سفر۔ اپنے اطراف سے یکسر بےنیاز قدرے فاصلے پر میرون نشست گاہ پر خاموش بیٹھا تھا۔ نورسین کی موجودگی سے اس کے تاثرات بدلے تھے نہ ہی چہرے پر مسرت کے رنگ بکھرے تھے۔ اس کی خاموشی کوئی اچھا تاثر نہ دے رہی تھی۔ اس کی بےنیازی کوئی اچھا گمان نہ دے رہی تھی۔

نفاست سے سجے کمرے میں عنزی خاندان کی امارت کا پتا دیتی ہر ایک شے نفی ہو گئی تھی۔ نورسین کے پاس نہ خوب صورتی کو سراہنے کا وقت تھا نہ ہی چاہ۔

وہ ادھم کے اس رویے، اور اجنبیت پر کچھ پریشان ہو رہی تھی۔ ذہن طرح طرح کے خدشات

میں گھر گیا تھا۔

اور یونہی اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ نورسین کا دل زوروں سے دھڑک اٹھا تھا۔

پھر وہ اسی متانت اور سنجیدگی سے قدم اٹھاتا اس کے پاس آ گیا تھا۔

نورسین نے اپنا اضطراب چھپانے کے لیے اپنی نگاہیں جھکا لی تھیں۔

اس کے روبرو بیٹھتے ادھم نے اس کا دودھیا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ وہ ذرا سا جھجکی تھی۔ گھبرائی تھی مگر ادھم کا لمس جیسے اسے تسلی، تشفی دینے کے لیے، اس کا خوف کم کرنے کے لیے تھا۔ چہرے پر سنجیدگی طاری کیے وہ اس کا ہاتھ گرفت میں لیے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔

''میرا رب سے ہر شکوہ آج دم توڑ چکا ہے۔''

ادھم بن مراد نے کچھ محبت، کچھ احترام سے اس کا ہاتھ دبایا تھا۔ جیسے گرفت مضبوط کر کے اسے امان کا احساس دلایا تھا۔ وہ اس کی اس حرکت پر حیران ہوئے بنا نہ رہ سکی تھی۔

خاموشی نے ایک بار پھر دونوں کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا مگر اس بار محض چند ثانیوں کے لیے۔

''میں خوش ہوں کہ تقدیر نے شریک حیات کے حوالے سے میرے ساتھ وہ کھیل نہیں کھیلا جو پچھلے پندرہ سالوں سے کھیل رہی ہے۔''

نورسین نے بے اختیار نظریں اٹھائیں۔ اسے ادھم بن مراد کی بات سمجھ میں نہ آئی تھی۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔ غالباً اسے بھی احساس ہوا تھا کہ اس نے اپنی نئی نویلی دلہن سے کچھ ایسا کہہ دیا ہے جو اس کے لیے ناقابل فہم ہے۔

''آج زندگی میں پہلی بار میرے نصیب میں محمود کی ٹھکرائی ہوئی، رد کی ہوئی شے نہیں آئی۔''

اور نورسین سانس نہ لے سکی تھی۔ اس کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔ اس کا دل دھک سے رکا تھا۔

''میرا مقدر ہمیشہ وہی چیز رہی جسے وہ رد کر دیتا تھا۔ ترک کر دیتا تھا۔'' مدھم آواز، پرسکون لہجہ۔ مگر

نورسین کا سانس رک رہا تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ پاتال میں گر رہی تھی۔

''بچپن سے ہی مجھے نفرت تھی محمود سے، اس کی چھوڑی ہوئی، ٹھکرائی ہوئی ہر اس چیز سے جو چچا میرے حوالے کر دیا کرتے تھے۔''

آتش دان میں آگ کی حدت سے چٹختی لکڑیاں ناکردہ خطاؤں کا بوجھ سہارے نورسین کے وجود پر چڑھ آئی تھیں۔

''آج میں خوش ہوں اور مطمئن بھی کہ شریک حیات کے حوالے سے اللہ نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ اس نے مجھے وہ عطا کیا جو اس نے میرے لیے تخلیق کیا۔''

نورسین کے سینے میں سبکی، ندامت اور خجالت کا لاوا ابلنے لگا۔

اس کا گلا خشک ہو چکا تھا، مٹھیاں بھیگ چکی تھیں۔ مضطرب نگاہیں کبھی ادھر بھٹکتی تھیں کبھی ادھر۔

اس نے تو معافی بھی مانگی تھی اپنے رب سے۔ اس نے تو غلطیوں کا ادراک کر کے انہیں سدھارنے کی کوشش بھی کی تھی پھر کیوں؟ پھر کیوں اسے ایک نئی آزمائش میں دھکیل دیا گیا تھا؟ اب کیوں؟ پھر سے کیوں؟

ہر بار اس کی سوچ، اس کا فیصلہ ہی غلط؟

ہر بار دکھ، درد، بے سکونی ہی اس کا مقدر؟

ماضی آسیب بن کر ایک بار پھر اس کے حواسوں پر سوار ہو چکا تھا۔ نئی زندگی تلخ حقائق کا بھیانک روپ دکھانے لگی تھی۔ اپنے نصیب کو سوچ کر۔ اپنی قسمت کو دیکھ کر۔ وہ ایک بار پھر خائف ہوئی تھی۔

اب کے جو سزا لکھی گئی تھی وہ ماضی کو حال میں مدغم کرنے والی تھی۔

''چلیں۔'' یکایک ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''کہ..... کہاں۔'' وہ اضطراب چھپانے میں ناکام رہی تھی۔

www.pdf.pklibrary.com

نورسین نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔
"درحقیقت یہ میرے چچا کا گھر ہے، میرا نہیں۔" ادھم نے وضاحت دی تھی۔
نورسین شاک کے عالم میں اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"کیا تمہارا نہیں خیال کہ ازدواجی زندگی کا آغاز ہمیں اپنے ذاتی گھر میں کرنا چاہیے۔" اس نے اپنا ہاتھ نورسین کی جانب بڑھایا۔
اپنی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ تھما دیا۔ سفید لباس کا دامن سمیٹ کر بستر سے اترتی نورسین کچھ بھی سمجھ نہ پا رہی تھی۔ وحشت ہی وحشت تھی ہر طرف۔ تاریکی ہی تاریکی۔
ادھم نے اس کا وہ بقچہ جس میں اس کے کپڑے تھے، اٹھایا اور دروازہ کھول کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے باہر آ گیا۔
عزی صاحب اپنی زوجہ کے ساتھ سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر بری طرح سے چونک گئے تھے۔
"ادھم۔" غصہ، خفت، ناراضی کے تاثرات بمشکل چھپائے وہ نیچے آ گئے تھے اور پھر انہوں نے قہر بار نظروں سے اسے یوں دیکھا تھا جیسے اسے کچا چبا جائیں گے۔
"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے تحمل سے دریافت کیا تھا۔
"اپنے گھر جا رہا ہوں۔" جواب اسی سرد مہری سے دیا گیا تھا۔
"کیا یہ تمہارا گھر نہیں ہے؟"
"یہ محمود کا گھر ہے۔"
عزی صاحب کو ایک لمحے کے لیے جیسے سکتہ ہوا تھا۔
سیڑھیوں سے اوپر، آہنی جالیوں کے اس طرف سندس کھڑی تھی۔ وہ چہرے پر تمسخرانہ مسکان سجائے اس منظر سے، گفتگو سے اور تخیلی تصویر میں رنگ بھرتے ان کرداروں سے محظوظ ہو رہی تھی۔

ادھم، نورسین کو ساتھ لیے جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔
"یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے۔" انہوں نے غضب کے عالم میں نورسین کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا تھا۔
ادھم بن مراد کو بھی رکنا پڑا تھا۔
"تو کیا آپ نے ٹھیک کیا؟ میری اجازت کے بغیر میری بیوی کو اپنے بیٹے کے گھر لے آئے۔" وہ تندی سے سوال پوچھتا ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔
عزی صاحب کو اس کی بدتمیزی نے سیخ پا کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ادھم نورسین کا لحاظ کر کے ان کے حکم کے آگے سر جھکا دے گا مگر وہ نورسین کا لحاظ نہیں کر رہا تھا۔ وہ کسی کا لحاظ نہیں کر رہا تھا۔
"میری زوجہ کا ہاتھ چھوڑ دیجیے، ہمیں تاخیر ہو رہی ہے۔"
"وہ جگہ گھر کہلانے کے لائق بھی ہے جہاں تم اسے لے جا رہے ہو؟" اپنی نرم مزاجی بالائے طاق رکھ کر وہ ادھم پر برس پڑے تھے۔ "جانتے ہو کس خاندان سے تعلق ہے اس کا؟"
"جانتا ہوں۔ بہت اچھے سے جانتا ہوں۔ غالباً اس کا باپ نہیں جانتا کہ میرا کس خاندان سے تعلق ہے اور یقیناً آپ نے بتایا بھی نہیں ہوگا۔ ہے نا۔" اس نے تمسخر اڑایا تھا۔
ایک لمحے کے لیے جیسے عزی صاحب کے پیروں تلے سے زمین نکلی تھی۔ ادھم بن مراد اپنا ہر حساب بے باک کرنا جانتا تھا۔
"کیوں میری عزت خاک کرنے پر تل گئے ہو؟" ان کی پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ چہرہ مزید سرخ ہوا تھا۔
"میں آپ کا بھتیجا ہوں بیٹا نہیں۔ میری کسی بھی حرکت سے آپ کی عزت خاک نہ ہوگی۔" اس کی آنکھیں خطرناک حد تک سرخ ہو رہی تھیں۔
"ادھم۔"
"ایک بات یاد رکھیں کہ نورسین کے والد سے

www.pdf.pklibrary.com

آپ نے جو وعدے کیے ہیں نہ وہ میں پورے کر سکتا ہوں۔ اور نہ میں ان خوابوں کی تعبیر بن سکتا ہوں جو آپ نے انہیں دکھائے ہیں۔" اس کا لہجہ مستحکم تھا۔ فیصلہ غیر متزلزل۔ اور عزی صاحب کے لیے حیرت کا موجب بھی کہ انہوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہ یوں پینترا بدلے گا؟ یوں ان کی آنکھوں میں دھول جھونکے گا۔

"تمہارے لیے میں نے اتنا کچھ کیا اور تم۔"

"اگر یہ احسان ہے تو اس کا بھاری بدلہ چکا دوں گا میں۔ آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ پہلے بھی تو میں نے آپ کے بے شمار احسانات کی بھاری قیمتیں چکائی ہیں نا؟"

عزی صاحب سانس نہ لے سکے تھے۔ کیا یہ وہی ادھم ہے جو آٹھ ماہ پہلے سر اٹھا کر، نظریں ملا کر ان سے بات تک نہ کر سکتا تھا؟ کیا یہ وہی سنگ تھا جسے انہوں نے پندرہ سالوں سے، بڑی محنت سے تراشا تھا؟ ہیئت تو وہی تھی پھر اس کا اندر کیسے بدل گیا تھا؟ حالات تو وہی تھے پھر اس کا بت کیسے بکھر گیا تھا؟ پر کٹ چکے تھے پھر بھی اس پر اڑان کا جنون سوار تھا۔ کیا ہو گیا تھا اسے؟؟

"بدلہ لے رہے ہو تم مجھ سے؟" ان کے لب ہلے تھے۔

"بدلہ....." ادھم نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔ "یہ آپ کو بدلہ نظر آتا ہے؟" پھر وہ ہنس دیا تھا۔ "میں تو اپنی زندگی جینے کی کوشش کر رہا ہوں چچا جان۔"

عزی صاحب نے بے اختیار نورسین کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

سندس کی مسکراہٹ یکایک گہری ہو گئی۔ اس کے لیے اس لمحے، ہر آواز، ہر للکار، ہر احساس مسرت کا باعث بن گیا تھا۔

نورسین کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کیے ادھم مرکزی دروازے کی جانب بڑھا تھا۔

عزی صاحب جو خفت اور ندامت کے احساس کے ساتھ اسے جاتا دیکھنے لگے تھے۔ یکایک ہی انہیں کچھ ہوا۔

"احسان فراموش۔" یکایک ہی عزی صاحب نے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑا تھا۔

"یہ میری غلطی ہے کہ میں نے سندس کی بہن سے تم جیسے گھٹیا انسان کی شادی ہونے دی، ورنہ اوقات کیا ہے تمہاری؟"

ادھم اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح عزی صاحب تیار نہ تھے۔

"کرتوت تمہارے ایسے ہیں کہ کوئی تمہیں اپنی بیٹی بھی نہ دے۔"

ایک ہی جست میں انہوں نے اسے عرش سے فرش پر لا پٹخا تھا۔ نورسین کے سامنے اس کی دھجیاں بکھرنے لگی تھیں۔

وہ ساکت نگاہوں سے اپنے سگے چچا کو دیکھنے لگا تھا بے یقینی سے۔ وہ راہ فرار ڈھونڈنے لگا تھا۔ مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے ناکامی کا سامنا ہوا تھا۔

سوچ پر تالے نہیں ڈالے جا سکتے تھے۔ زبانوں کو مقفل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"اگر میں کوشش نہ کرتا تو یہ رشتہ کبھی نہ ہوتا اور تم اس طرح میرے سامنے شیر بن کر نہ دھاڑ رہے ہوتے۔"

ادھم نے نورسین کے سامنے انہیں بے عزت کیا تھا وہ اس کا بدلہ کیوں نہ چکاتے؟ وہ ان کی عزت مٹی کر رہا تھا، وہ کیوں نہ اسے خاک کرتے؟

"تمہیں پال پوس کر بڑا کیا، تعلیم دلائی، گھر، دولت۔ عزت۔ کس چیز کی کمی ہونے دی میں نے تمہیں اور تم مجھے اس کا یہ صلہ دے رہے ہو؟" انہوں نے بلند آواز میں اسے جھڑکا تھا۔ نفرت، حقارت، عداوت غصہ ان کے پور پور سے عیاں تھا۔

"اوقات کیا ہے تمہاری؟ ہو کون تم؟ ساری عمر میرے ٹکڑوں پر پلتے رہے ہو اور آج مجھے آنکھیں دکھا رہے ہو۔ مجھے چاہیے تھا، میں نعیم آفندی سے کہہ

www.pdf.pklibrary.com

دیتا کہ اس بدکردار انسان کے ساتھ تم جو سلوک کرنا چاہو کرو۔"

شادی کی پہلی رات۔ نئی نویلی دلہن کے سامنے اس کی عزت خاک میں ملا کر انہوں نے آخری کیل اس کے تابوت میں ٹھونک دی تھی۔

ایک لمحے کے لیے وہ ٹوٹا تھا۔ پھر بکھر گیا تھا۔

رنج والم سے نم آنکھیں عزمی صاحب کے چہرے پر جو ٹھہریں تو پھر وہ ہٹ نہ سکیں۔ بچپن سے لے کر آج تک اس کا عزمی صاحب کو دیکھنے کا انداز نہیں بدلا تھا۔

"اور جس پر تم حق جتا رہے ہو، یہ میرے توسط سے اس گھر میں آئی ہے، میرے توسط سے۔"

ادھم نے نورسین کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ جو سکتے کے عالم میں اس دوران بالکل خاموش کھڑی تھی۔ وہ جو شدت سے دھڑکتے دل کی بازگشت سنتی اذیتوں کی دلدل میں اتر رہی تھی۔ وہ اب صدمے کی تند و تیز ہواؤں کی زد میں ادھم بن مراد کو دیکھنے لگی تھی۔

سزا! سزا! سزا!

"کہیں نہیں جائے گی یہ! اسی گھر میں رہے گی۔ سنا تم نے۔" نورسین کو بازو سے پکڑ کر انہوں نے اسے ادھم سے دور ہٹایا تھا۔

وہ گھر جو چاہت سے تعمیر ہوا تھا، وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوا تھا۔ خواب دونوں طرف سے خاک ہوئے تھے۔ حالات نے دونوں کو ہی برباد کیا تھا۔

ادھم نے نورسین کا لچھا نیچے رکھ دیا۔ مزید کچھ سنے۔ کچھ کہے بنا وہ آہستہ سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے باہر نکل گیا اور نورسین اس وسیع و عریض، شاندار مکان میں اندھیروں میں گھری تنہا کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اذیت کے اندھیروں میں جو پہلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی، وہ عزمی صاحب کی تھی جو معذرت کرتے اسے کمرے میں جانے کا کہہ رہے تھے۔ وہ ادھم کی خودساختہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگ رہے تھے۔ وہ سب کچھ بہتر ہو جانے کا یقین دلا رہے تھے۔

ہر غلطی ادھم کی تھی۔ ہر قصور ادھم کا تھا۔

ان سے تو ایک چھوٹی سی بھول ہوئی تھی۔ اک ذرا سی غفلت ہوئی تھی کہ وہ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ بدل گیا ہے سدھر گیا ہے۔ ہدایت پا چکا ہے۔ اصلاح کر چکا ہے۔

اور نورسین۔ وہ ساکت نگاہوں سے اس دروازے کو دیکھ رہی تھی جو ابھی ابھی مقفل ہوا تھا۔ وہ اس آواز کو کھوج رہی تھی جو ابھی ابھی ساکت ہوئی تھی۔ پھر وہ اس خواب کو ڈھونڈنے لگی تھی جو یہیں کہیں ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔

اندر کے سناٹے سے خائف ہو کر وہ دبے قدم پیچھے ہوئی تھی پھر سسکتے ہوئے نیچے بیٹھ گئی تھی۔

عزمی صاحب کچھ دیر تک اسے سمجھاتے بجھاتے رہے تھے۔ تسلی اور دلاسے دیتے رہے تھے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے سندس نے بھی اپنے حجرے کا رخ کیا تھا۔ اس کی ساس بھی جا چکی تھیں۔

اب وہ تھی وہاں۔ صرف وہ۔ تنہا۔ بے بس۔ لاچار!

سزا......سزا......سزا!!!

ہر سمت ایک ہی صدا تھی۔ ایک ہی گونج۔ ایک ہی آواز!

میری غلطیوں اور گناہوں کی اتنی بڑی سزا؟ آخر کیوں میرے اللہ؟ آخر کیوں؟" اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

عقب میں قدموں کی آہٹ ہوئی۔ کوئی بے حد قریب آن کھڑا ہوا تھا۔

"میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ ادھم تمہارے لیے غیر مناسب ہے مگر تم نے میری بات کو کوئی اہمیت

www.pdf.pklibrary.com

خاموش تماشائی نے لب کشائی کر کے اس کے تمام زخموں کو بری طرح سے ادھیڑ ڈالا تھا۔

نورسین نے بے اختیار سر اٹھایا۔

یہ آخری آواز بھی جو وہ اس لمحے سننا چاہتی تھی۔

یہ آخری شخص تھا جسے وہ اس لمحے دیکھنا چاہتی تھی۔

"اب بھی وقت ہے۔ اپنے لیے بہتر فیصلہ کر لو۔" وہ کہہ رہا تھا۔

نورسین مٹھیاں بھینچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر سلگتی نگاہیں محمود کے چہرے پر گاڑ دی تھیں۔

"میرا فیصلہ ایک بار تو غلط ہو سکتا ہے، ہر بار نہیں۔"

لب بھینچ کر دانت پیستے چٹانوں جیسی مضبوطی لہجے میں سمو کر اس نے جواب دیا تھا پھر لباس کا دامن دونوں ہاتھوں میں سنبھالے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی تھی۔

اندر ہی اندر کوئلے کی طرح سلگتا محمود لب بھینچے اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

گھر سے باہر آ کر نورسین نے اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ کر دیوار کا سہارا لیا تھا پھر اس نے اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔ آنکھوں کو بے دردی سے رگڑ کر، گالوں پر اذیت کا ہر نشان مٹا کر اس نے خود کو رونے سے باز رکھنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ مگر وہ رو رہی تھی۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کی روح رو رہی تھی۔

ہر امید دم توڑ گئی تھی۔ ہر تمنا راکھ ہو گئی تھی۔

ٹانگوں نے جواب دیا تو وہ سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئی۔

گھر کے مکین اپنا فرض نبھا چکے تھے مگر جو فرض اس کے کندھوں پر تھا اس کا کیا؟ وہ اپنے تئیں معاملہ سنبھال چکے تھے مگر جو مصیبت اس پر آن پڑی تھی اس کا کیا؟

عزی صاحب اسے لینے آئے، ان کی زوجہ بھی۔ سندس بھی۔ محمود بھی۔ مگر وہ کہیں نہ گئی۔ کسی بھی صورت اندر جانے کو رضامند نہ ہوئی۔

کتنے لمحے بیتے، کتنی ساعتیں گزریں۔ کچھ پتا نہ چلا۔ اندر کا شور اتنا زیادہ تھا کہ باہر کی ہر آواز دم توڑ گئی تھی۔

ساکت نگاہوں سے مدھم روشنی میں ہر ایک شے کو تکتے اس کی سماعت سے قدموں کی چاپ ٹکرائی۔

عزی صاحب کے بیرونی دروازے پر اچانک کوئی نمودار ہوا تھا۔

وہ ادھم تھا۔ ابن مراد۔

غالباً وہ اصطبل میں بندھا اپنا گھوڑا لینے آیا تھا۔

سیڑھیوں پر باہر اندھیرے میں بیٹھی نورسین پر نظر پڑتے ہی اصطبل کی جانب بڑھتے اس کے قدم تھمے تھے۔ وہ رکا تھا اور پھر رکا رہ گیا تھا۔

حیرت۔ بے یقینی۔ استعجاب۔ دکھ۔ پشیمانی۔

کیا تھا اس لمحے جو ادھم کی آنکھوں میں نہیں ابھرا تھا۔

کیا تھا جس نے اسے پتھر کر کے نہیں توڑا تھا۔

خیال سے لڑتے گمان سے بھڑتے یونہی بے اختیاری کے عالم میں وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔

سیڑھیوں پر اس کے روبرو پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے جھکا تھا۔

نورسین نمناک آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تھی اور وہ اسے۔ وقت دونوں کے لیے رک سا گیا تھا۔ دھرتی کی ہر روشنی ان پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ گرد و نواح کی ہر ایک شے اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھی۔

اب وہاں ایک ادھم تھا۔

ایک نورسین تھی۔

ایک کے لیے وہ منظر، وہ گھڑی خواب سی تھی۔

دوسرے کے لیے ایک فریب، ایک خیال، ایک سراب۔

ایک کو سزا کے اندوہناک ہونے کا ڈر تھا تو

www.pdf.pklibrary.com

دوسرے کو خواب سے بیدار ہو جانے کا خدشہ۔

پہیلیوں کی طرح اسرار میں ڈھل کر۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

کہیں کوئی خیال چبھنے لگتا تھا۔ کہیں کوئی خدشہ رونے لگتا تھا۔ کہیں کوئی درد ہلکنے لگتا تھا۔ کہیں کوئی خواب تڑپنے لگتا تھا۔ حقیقت کی عجب تلخ ڈوریاں تھیں۔ سلجھنے میں ہی نہ آتی تھیں۔

"کیا ہمارا گھر بہت دور ہے؟"

خاموشی کا قفل نورسین نے توڑا تھا۔ اس کی کانپتی آواز میں سوال کی لے پر نہ جانے وہ کون سا احساس تھا جس نے ادھم بن مراد کو منجمد کر دیا تھا۔ آنکھوں میں حزن لیے وہ سراپا حیرت واستعجاب بنا اس لڑکی کو بے یقینی سے دیکھنے لگا تھا۔

وہ طعن وتشنیع کی توقع رکھتا تھا۔ سوال کی نہیں۔

وہ شکوہ وشکایت کی امید رکھتا تھا۔ استفسار کی نہیں۔

خوف اور وحشت اس لڑکی کے پور پور سے عیاں تھی مگر وہ پھر بھی اس سے گھر کا پوچھ رہی تھی۔ اپنے گھر کا پوچھ رہی تھی۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

"نہیں۔ زیادہ دور نہیں۔" ادھم کے لب ہلے تھے۔

گھر تو دل سے بنتے ہیں۔ دل میں بستے ہیں۔ مسافت دل طے کر لے تو زمینی فاصلوں کی کیا اوقات رہ جاتی ہے؟

وہ بھی ایک ایسا ہی فاصلہ تھا۔ صدیوں پر مشتمل۔ جو لمحوں میں طے ہوا تھا۔

"تو کیا ہمیں۔" نورسین نے آنکھوں میں ابھرتی نمی کو دبا کر حتی الامکان کوشش کی کہ آواز آنسوؤں سے بوجھل نہ ہو۔ "کیا ہمیں اب سفر شروع نہیں کر دینا چاہیے؟"

ادھم اسے دیکھ کر رہ گیا۔ بے قراری سے انگلیاں مروڑتی چاندی کی اس مورت کا اضطراب عروج پر تھا۔

"ہاں۔" اس نے اٹھتے ہوئے نورسین کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ "ہمیں اب چلنا چاہیے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ادھم گھر سے اس کا سامان لے آیا تھا۔ پھر وہ دونوں اصطبل سے گھوڑا لے کر باہر نکل گئے تھے۔

بالائی منزل پر مجلس کی کھڑکی سے باہر جھانکتے محمود عنزی نے غیض وغضب کے عالم میں کانچ کا ظروف ماربل کے فرش پر دے مارا تھا۔ چھناکے کے ساتھ کچھ ٹوٹا تھا۔ اس کے اندر بھی۔ باہر بھی۔

اور پھر طویل خاموشی نے گھر کے در و دیوار کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

☆☆☆

سرسبز وادیوں اور گھاٹیوں سے گھرا وہ راستہ شہر بریدہ کے قرب وجوار میں پھیلی ان بستیوں کی طرف جاتا تھا جو عرصہ دراز سے شہر کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے جدا تھیں۔ یہاں ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ بدلتے وقت کے تقاضوں سے ماورا۔ اسرار و رموز سے بالاتر۔

تنگ گلیوں پر جھکے کچے مکان رات کے اس پہر عجب وحشت کا سا سماں پیدا کر رہے تھے۔ کچھ کھڑکیاں تاریک ہو چکی تھیں، کچھ نہیں بھی ہوئی تھیں۔ دکانیں بند تھیں۔ گلیاں، کوچے، چوبارے سنسان۔ اور خاموشی اتنی گہری، اتنی پرسکون تھی کہ اگر جو سوئی بھی پھینکی جاتی تو اس کی گونج بھی سنائی دیتی۔ واحد آواز جو اس لمحے سکوت کو توڑ رہی تھی وہ اس گھوڑے کی ٹاپوں اور سانسوں کی آواز تھی جس کی پشت پر وہ ادھم بن مراد کے ہمراہ سوار تھی۔

پتھریلے راستوں پر جا بجا بارش کا پانی جمع تھا جس پر زرکار کرنیں منعکس ہو رہی تھیں۔

زندگی کے آثار نمایاں تھے مگر ان بستیوں کے متعلق جو کچھ اس نے سن رکھا تھا، وہ خدشات کی صورت پر اس کے دماغ پر سوار ہو چکا تھا۔ خوف اور گھبراہٹ کے عالم میں اس نے سر اٹھا کر اطراف

www.pdf.pklibrary.com

میں نگاہ دوڑائی۔

ادھم ایک ہی جست میں گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ ہر منظر، ہر آہٹ، ہر آواز سے ماورا۔ خوف، وحشت اور بے سکونی کے ہر احساس سے بے نیاز وہ گھوڑے کی باگ تھامے مشرقی گلی کی جانب بڑھ گیا تھا جو دوسرے تمام راستوں اور گلیوں کی نسبت، زیادہ تاریک، زیادہ ویران، زیادہ سنسان تھی۔

وادیٔ برکان کے جنگلات میں تن تنہا قدرت کی ہر شے سے دوستی نبھانے والی نورسین کا دل اچک کر حلق میں آ گیا تھا۔ خوف سے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

برکان کی طرف سے چلتی مشرقی ہواؤں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ کبھی نہ تھی۔

یک دم گھوڑا ہنہنانے لگا۔ آواز بلند ہوئی۔ پھر مزید بلند ہوئی۔ ادھم نے گھبرا کر اطراف میں نگاہ دوڑائی پھر سرزنش کے سے انداز میں اپنے گھوڑے کو گھوری دی۔ گھوڑے نے اپنا سر گرا لیا۔ وہ بے بس تھا۔ اس کا احتجاج بجا تھا۔ ادھم کے گھر کو جاتی گلی تنگ تھی۔ وہ اندر نہ جا سکتا تھا۔

ادھم بھی بے بس تھا۔ اس کا احتجاج بھی بجا تھا۔ کہ راستے کی کچی مٹی کیچڑ میں ڈھل چکی تھی۔ بارش کا پانی بھی ٹھیک سے خشک نہ ہوا تھا۔ اس صورت میں وہ اپنی دلہن کو پیدل لے کر جاتا بھی تو کیسے؟

دفعتاً عقب میں مردانہ آواز گونجی۔

''ادھم؟'' سنسناتی آواز نے پکارا۔ ''کیا تم ادھم ہو؟''

پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے قیاس پر یقین کر کے وہ شخص خوشی کے عالم میں چیخ اٹھا تھا۔

''ادھم......ادھم......آ گیا''

شمعیں جل گئیں، روشنیاں بکھر گئیں اور گلیوں میں جھکے کچے مکانوں کی کھڑکیاں کھٹ کھٹ کھلنے لگیں۔

وہ گھر جو ویران لگ رہے تھے اب آباد ہو چکے تھے۔ وہ گلیاں جو تاریک تھیں روشنیوں میں نہا گئی تھیں۔ وہ بستی جو خاموش تھی، سرگوشیوں میں ڈھل گئی تھی۔

کوئی کسی گلی سے آیا تھا کوئی کسی گلی سے۔ کوئی کھڑکی سے کودا تھا۔ کوئی چھت سے لپکا تھا۔ کوئی سیڑھیوں سے اترا تھا۔ کوئی دروازے سے نکلا تھا۔

آن کی آن میں وہاں لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ عورتیں۔ مرد۔ بچے بوڑھے جوان سب نے ہی انہیں ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔

نورسین گھوڑے پر سوار تھی۔ اپنے چاروں طرف بھانت بھانت کے لوگوں کو، ان کے ہنستے مسکراتے چہروں کو، اشتیاق سے پر تجسس آنکھوں کو دیکھ کر کچھ خجل، کچھ حیران، کچھ پریشان ہو گئی تھی۔

''ادھم! تم آ گئے۔''

''ادھم! یہ کون ہے؟''

''ادھم! تم کسے ساتھ لائے ہو؟''

''ادھم! تم اتنا عرصہ کہاں غائب رہے۔''

''ادھم! تم ٹھیک ہو؟''

''ادھم! اس طرف دیکھو۔''

ادھم! یہ...... ادھم اوہ...... سوال در سوال۔

ہر آواز میں فکر تھی۔ محبت تھی۔ احساس تھا۔

آنکھوں میں حیرت و استعجاب لیے نورسین نے ادھم کو دیکھا۔ جو اس تمام عرصے اس اندھیرے کا حصہ بننے کی کوشش کر رہا تھا جو رہا ہی نہ تھا۔

کسی نے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ موڑا۔ چہرہ واضح ہوا تو سب نے اسے دیکھا۔

اس کی بھنویں سکڑی ہوئی تھیں۔ تیور بگڑے ہوئے تھے۔ وہ پیشانی پر ابھرتے ٹھنڈے پسینے کو بار بار صاف کر رہا تھا۔ بار بار اپنے کان کی لوؤں کو چھیڑ رہا تھا۔ بار بار اپنے جوتے کی نوک سے مٹی کرید رہا تھا۔

وہ ان کے کسی سوال کا جواب دے رہا تھا نہ ہی توجہ فرما رہا تھا۔ فرار کے تمام راستے مسدود تھے۔ وہ غائب بھی نہ ہو سکتا تھا۔

www.pdf.pklibrary.com

پھر کسی بھلی عورت نے نورسین کے لباس کو جانچا، پرکھا اور بغیر تصدیق کے اعلان کر دیا۔
''ادھم کی دلہن! ادھم کی دلہن!''
بس پھر کیا تھا۔
دکانیں کھل گئیں۔ ریستوران کھل گئے۔ کرسیاں میزیں بچھائی جانے لگیں۔ موم بتیاں جلائی گئیں۔ فانوس سجائے گئے۔ کوئی اپنے گھر سے کچھ لا رہا تھا۔ کوئی کچھ۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستی کا مرکزی حصہ شادی گھر کا سا منظر پیش کرنے لگا۔ نورسین کو گھوڑے سے اتار کر اسے سجی سجائی کرسی پر بٹھایا گیا۔ ادھم کو بھی کھینچ کھانچ کر وہاں لایا گیا۔ مشروبات کا دور چلنے لگا۔
افراح کا رقص ازسرِنو شروع ہوا، گیت گائے گئے، مسکراہٹیں بانٹی گئیں۔ شور و غل میں ایک میلہ سا سج گیا۔ اور اس عرصے میں نورسین دنیا جہاں سے کٹ کر اس بستی سے، اسی بستی کے لوگوں تک محدود ہو گئی۔
دھرتی کی تمام رونقیں اس بستی پر سایہ فگن ہوئیں۔ اندھیرے کی دبیز تہیں آسمان کو اٹھنے لگیں۔ زندگی کی ہر تلخ یاد، ہر تلخ خیال ان میں غرق ہونے لگا۔
ہنستے مسکراتے خوش اخلاقی سے پیش آتے لوگوں کی محبت اسے کہیں اور لے گئی۔ اس دنیا سے دور۔ زندگی سے دور۔
سکون ایسے بھی ملتا ہے؟ خوشیاں ایسی بھی ملتی ہیں؟ وہ حیران ہوئی تھی۔
اس دوران کچھ نوجوان لڑکے ادھم کے گھر کو جاتی گلی میں لکڑی کے تختے بچھانے لگے تھے۔ وہ اس کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ ادھم ان کی مدد کو بار بار اٹھ رہا تھا اور بستی کے بزرگ اسے بار بار کھینچ کر واپس لے آتے تھے۔
''مجھے کام کرنے دیجیے۔''
''کام ہوتے رہیں گے تمہیں اپنی دلہن کے ساتھ بیٹھنا چاہیے۔''
''میں بیٹھ چکا، اب تو جانے دیجیے۔''
''اتنی جلدی نہیں، ہرگز نہیں۔''
''راستہ بن چکا اب تو اجازت دیجیے۔''
''ہرگز نہیں! ہرگز نہیں۔''
''تھوڑا خیال کیجیے، میری دلہن پریشان ہو رہی ہے۔'' اس نے جھک کر بزرگ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔
''صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم پریشان ہو رہے ہو؟''
ادھم گڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا تھا۔
خدا خدا کر کے راستہ مکمل ہوا تو پھولوں کے لالے پڑ گئے۔ اس مسئلے کو سلجھانے کے لیے نوجوانوں کو قریبی جنگل بھیج کر پھول منگوائے گئے۔ پھر ان پھولوں کو ٹوکروں میں بھر کر خواتین راستوں میں کھڑی ہو گئیں۔
جس لمحے وہ لباس کا دامن سنبھالے ادھم کے ہمراہ ترتیب سے رکھے لکڑی کے تختوں پر قدم رکھ رہی تھی اس لمحے اس پر پھول نچھاور ہو رہے تھے۔ عام سی بستی کے عام سے لوگوں میں وہ منظر خاص بن گیا تھا۔ بے حد خاص۔
''رب سے دعا ہے اس کی رحمت تم دونوں پر سایہ فگن رہے۔'' ایک بزرگ خاتون نے اس کا ہاتھ تھام کر دعا دی تھی۔
''آمین! ثم آمین۔'' نورسین کی آنکھیں بے اختیار نم ہوئیں۔
جس لمحے اس نے ادھم کے ہمراہ ''اپنے گھر'' میں قدم رکھا تھا اس لمحے بستی کے لوگ ان کے لیے دعائے خیر کرتے واپس پلٹ گئے تھے۔
کھڑکیاں بتدریج بند ہوتے لگیں۔ راستے گلیاں، چوبارے سنسان ہوتے گئے، دکانیں مقفل ہوئیں۔ سب نے گھروں کو رخ کیا اور ایک بار پھر وہ بستی خاموشی کا لبادہ اوڑھے گہری رات کے پردوں میں کہیں چھپ گئی تھی۔

---

یہاں سے دور شہر بریدہ کے مضافات میں

عنزی بنگلہ کی دوسری منزل پر کوئی شخص ساری رات سگار پیتا جاگتا رہا تھا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر تھا۔ موم بتیاں پگھل کر ڈھیر ہو چکی تھیں۔ سگار انگلیوں میں دبائے وہ طویل نشست گاہ پر نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرہ بے رنگ ہو چکا تھا۔

وہ قسمت کو دیکھ رہا تھا۔ نصیب کو کھوج رہا تھا۔ قلب نے سیدھی چال چلی تھی مگر احساسات کا نتیجہ برعکس نکلا تھا۔

آشنائی کا جرم نہ اس پل چھین لینے دیتا تھا اسے نہ اس پل۔

اور وہ حیران تھا۔ وہ خود پر حیران تھا۔ اپنی سوچ پر، اپنے گمان پر حیران تھا۔

جب والد نے پہلی بار اسے نورسین اور ادھم کے رشتے سے آگاہ کیا تھا تو اس گھڑی اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہوا تھا۔ وہ جھرنا جو قرب و جوار میں کہیں بلندی سے بہہ رہا تھا اس کی زد میں اپنا آپ گہرائی میں اترتا محسوس ہوا تھا۔

نورسین اور ادھم۔

ادھم اور نورسین۔

کب؟ کیسے؟ کیوں؟

دو معمولی لوگ جب ایک ہونے لگے تھے تو وہ یکایک ہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی الجھن، سب سے بڑا راز، سب سے بڑی ضد بن گئے تھے۔

نورسین ادھم بن مراد کی نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی بھی صورت نہیں۔

مگر اسے خبر ہی تب ملی تھی جب رشتہ ہو چکا تھا۔ تاریخ طے پا چکی تھی۔ شادی، گھر، ملبوسات، حق مہر ہر شے کا بندوبست ہو چکا تھا اور یہ سب کام اس کے والد کر رہے تھے۔ اس کے جذبات اور احساسات سے بے خبر بڑھ چڑھ کر کر رہے تھے۔

اب نہ وہ اپنا موقف بیان کر سکتا تھا اور نہ ہی وہ اسے مٹا سکتا تھا جو لکھا جا چکا تھا۔

اس نے ہمیشہ اپنی ٹھکرائی ہوئی شے ادھم بن مراد کے پاس دیکھی تھی مگر زندگی میں پہلی بار وہ نورسین امجاد کو ادھم بن مراد کے نام ہوتا دیکھ کر رنجیدہ ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی وجود کا، اپنے سوا کسی اور کا ہو جانے پر دکھ ہوا تھا۔

نورسین۔ جس سے اسے کبھی محبت نہ ہو سکی تھی۔ جس کے ساتھ بیتے وعدے وعید پر مشتمل وہ سات سال اس نے اپنی انگلیوں پر گن کر لمحوں میں اڑائے تھے۔ وہ محبت جو اسے کبھی زیر کر ہی نہ سکی تھی۔ وہ خیال جو اسے بیدار کر ہی نہ سکا تھا۔ تو اب کیوں وہ اذیت میں آ گیا تھا؟ کیوں اس کا دم گھٹنے لگا تھا؟ دل رکنے لگا تھا؟

اس کا ہر وعدہ۔ ہر عہد۔ ہر امید۔ ہر آس۔ ہر یقین نورسین سے بات کرنے کے لیے۔ اس سے چند گھڑیوں کی ملاقات کرنے کے لیے ہوتا تھا۔ تعلق تھا تو صرف اسی حد تک تھا۔ اس سے آگے اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ وہ عہد تو محض باتیں تھیں۔ وہ محبت تو فقط اک لفظ تھا۔ لفظ بھی۔ اور وقت گزاری بھی۔

”وقت گزاری؟ کیا وہ وقت گزاری ہی تھی محمود؟“

دل کے نہاں خانے میں کوئی خیال چوٹ بن کر اترا تھا۔

چاہت تو کبھی تھی ہی نہیں تو پھر اب یہ جو آگ جل رہی تھی، یہ کیوں جل رہی تھی؟ وہ اسے جھلسا کیوں رہی تھی؟ فنا کیوں کر رہی تھی؟ اور ادھم بن مراد کی سنگت میں نورسین کا وجود اس سے برداشت کیوں نہیں ہو رہا تھا؟

حالانکہ بدلا تو کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے حصے میں اب بھی تو کچھ ایسا ہی آیا تھا جسے وہ ٹھکرا چکا تھا؟ کہ نہیں؟؟

محمود نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

اسے ادھم کی زندگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نہ ہی وہ اسے اس قابل سمجھتا تھا۔

www.pdf.pklibrary.com

پندرہ سال اس نے ادھم بن مراد کو مسلسل نظر انداز کیا تھا۔ اب پچھلے پندرہ دنوں سے وہ مسلسل اس کے حواسوں پر سوار تھا۔

ادھم بن مراد۔ جسے وہ اپنی رد کی ہوئی، ٹھکرائی ہوئی ہر شے کا مستحق سمجھتا تھا۔ جسے وہ خیرات کے روپ میں اپنی ہر مستعمل چیز دان کر دیتا تھا۔ کپڑوں سے لے کر، بیٹ، گیم، کتابیں، پالتو جانور اور ملازم تک۔

دوست، ساتھی اور جان پہچان والی لڑکیاں البتہ اس کی ذات تک ہی محدود رہتی تھیں۔ کہ اسے اپنے اور ادھم بن مراد کے درمیان اس فرق کو برقرار رکھنا اور اس حد کو قائم رکھنا آتا تھا جو یوم اول سے عزیز صاحب نے دونوں کے مابین دیوار کی صورت میں استوار کر دیا تھا۔

ادھم بن مراد۔ وہ اس گھر کا فرد ہی کہاں تھا؟ اس کی حیثیت تو ایک ملازم کی سی تھی۔ ملازموں سے بھی کچھ کم۔ کیونکہ ملازم تو اس گھر کی ضرورت تھے۔ وہ تو ضرورت بھی نہ تھا۔ ایک ان چاہا وجود جو ایک مجبوری، ایک بوجھ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

ملازموں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ملازموں میں اس کا کھانا پینا تھا۔ ملازم ہی اس کے دوست تھے۔ ساتھی تھے۔ ہمدرد تھے۔

اس گھر سے۔ اس گھر کے مکینوں سے اس کا تعلق اس پائے کا تھا ہی نہیں کہ وہ سندس کی بہن نورسین کے مقدر میں لکھ دیا جاتا۔

دنیا جہان کی تمام لڑکیوں میں صرف نورسین ہی اس کے مقدر میں کیوں لکھ دی گئی تھی؟ کیا اس لیے کہ وہ اسے رد کر چکا تھا؟ ترک کر چکا تھا؟

وہ پاگل ہو رہا تھا۔ وہ پاگل پن کی حد تک اپنی سوچ کے دائروں کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ اپنے دل کے خانوں کو نوچ رہا تھا۔

اور نورسین...... وہ کیسے مان گئی تھی؟ وہ تو مختلف خیالات کی مالک پڑھی لکھی، ایک سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ امیر باپ کی چھوٹی اور لاڈلی بیٹی۔ اس نے کیوں ادھم بن مراد جیسے نوجوان کا رشتہ قبول کر لیا تھا؟ کیسے اسے اپنا لیا تھا؟

سندس خاموش تو نہیں رہی ہو گی، اس نے بتایا تو ہو گا کہ وہ کس حیثیت کا نوجوان ہے۔ اس کے باوجود نورسین نے رضامندی کا عندیہ دے دیا؟ اپنے لیے ادھم جیسے نوجوان کا انتخاب کر لیا۔

انتقام کے لیے؟ بدلہ کے لیے؟ پھانس کی طرح کوئی شے اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی تھی۔

وہ انگلیوں سے اپنی پیشانی مسلتا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

مجلس کے بند دروازے کے دوسری طرف سندس کھڑی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے دروازہ بجا رہی تھی۔ جانے کب سے اسے آوازیں دے رہی تھی۔

وہ دروازہ نہیں کھول رہا تھا۔ جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔

سندس کی آنکھوں میں غصہ تھا۔ قہر تھا۔ بے یقینی تھی۔ بدگمانی تھی۔ آخر نورسین کی شادی کا وہ اتنا اثر کیسے لے سکتا ہے؟ کیسے وہ یوں سرعام اس کا، اس کی محبت کا، اس کے حسن کا تماشا بنا سکتا ہے؟ کیسے وہ اس کی حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے؟ اس کی موجودگی کو نظر انداز کر سکتا ہے؟

کیسے؟ آخر کیسے؟

"دعا کرو وہ تمہارا ہی رہے۔" گھر کی خاموشی میں کہیں نورسین کی آواز تڑپ بن کر گونجی تھی۔

مجلس کا دروازہ بجاتے اس کے ہاتھ یک دم رکے تھے۔ اس کا تنفس یکا یک تیز ہوا تھا۔

دل میں خدشے کا روپ دھارے کسی سوال نے سر اٹھایا تھا۔ جس کی تردید میں اس نے فوراً نفی میں گردن ہلائی تھی۔

محمود اور سندس کے لیے وہ رات بڑی طویل تھی۔ گزرنے میں نہ آتی تھی۔ وہ احساس بڑا ہی کرب ناک تھا۔ مٹنے میں نہ آتا تھا۔

کچھ چھن جانے کا جو خدشہ تھا، وہ دونوں کی

www.pdf.pklibrary.com

رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگا تھا۔

جو بے اعتنائی اور بے وفائی کا زہر دونوں نے کسی کے دل میں اتارا تھا وہ زہر اب ان پر بھی اثر کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

خواب گاہ اور چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل کچی اینٹوں کے مختصر مکان کا جائزہ اس نے اگلے دن صبح کے پرنور اجالے میں لیا تھا۔ گھر میں ضرورت کی چند اشیاء کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

نہ الماریاں تھیں۔ نہ سجاوٹی فانوس تھے۔ نہ آرائشی برتن تھے۔

ویران اداس آنکھوں سے اس نے ہر ایک شے کو دیکھا پھر اس نے ایک ایک شے کو ہاتھ لگایا۔ محسوس کر کے اس پر حق ملکیت جتایا۔ اس نے کھڑکیوں دروازوں، دیواروں اور برآمدے میں رکھے تمام پودوں کو بتایا کہ وہ ان کی مالکن ہے۔

وہ اسے اپنا گھر بنا رہی تھی۔ خواہشات اور جذبات کو دفنا کر اس چھوٹے سے مکان کو اپنا مسکن بنا رہی تھی۔

اور پھر یونہی بیٹھے بیٹھے اسے نہ جانے کیوں رونا آیا۔ حالانکہ یہ سزا تھی اور سزا اگر آسائشات زندگی سے جڑی ہو تو وہ پھر سزا تو نہ کہلاتی۔

یونہی خیالات سے لڑتے وہ آہستہ سے اٹھی اور خواب گاہ کی اکلوتی کھڑکی کھٹاک سے کھول دی۔ چوکھٹ پر بیٹھی چڑیا چہچہاتے ہوئے اڑ گئی۔

نورسین کی مداخلت اسے ہرگز پسند نہ آئی تھی تب ہی وہ سامنے منڈیر پر ٹک کر چوں چوں کرنے لگی تھی۔ احتجاجاً۔ اس کے دانے، اس کے نام کا رزق چوکھٹ پر بکھرا تھا۔ اسی مقام پر جہاں نورسین کھڑی تھی۔

نورسین نے دانوں کو مٹھی میں بھر کر سامنے والی دیوار پر اچھال دیا۔ کچھ دانے نیچے جا گرے، کچھ منڈیر پر گرے اور کچھ منڈیر کے اس پار۔

چڑیا چیخ مار کر اڑی۔ حیران ہو کر۔ غصہ دکھا کر۔ پھر فضا میں منڈلانے لگی۔ وہ کبھی اوپر جاتی۔ کبھی نیچے آتی۔ کبھی دیوار پر اچھلتی اور کبھی نیچے گھوم جاتی۔

نورسین دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

جب ہر لحاظ سے چڑیا کو امن وامان کا احساس ہو چکا تو وہ فاصلے پر ہی منڈیر پر بکھرے دانے چگنے لگی۔

اور نورسین خاموشی اور سکون سے نیلاہٹ میں سمائے وسیع وعریض آسمان کا نظارہ کرنے لگی۔

اور تب ہی اسے عقب میں آہٹ کا احساس ہوا تھا۔ ادھم غالباً ابھی ابھی مسجد سے لوٹا تھا۔ جوتے اتارے وہ سیدھا اس کے عقب میں بے حد قریب آن کھڑا ہوا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ عود کی اس خوشبو کو محسوس کر سکتی تھی جو وہ جانے سے پہلے اپنے کپڑوں پر لگا کر گیا تھا۔

کچھ دیر تک وہ دونوں یونہی آسمان پر کسی غیر مرئی نقطے کو کھوجتے رہے اور اڑان بھرتے طرح طرح کے پرندوں کا دور دور تک تعاقب کرتے رہے۔

پھر خاموشی سے اکتا کر ادھم بن مراد نے کھڑکی کے پٹ پر آہستہ سے دستک دے کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا تھا اور وہ متوجہ نہ ہوئی تھی۔ ہونا ہی نہ چاہتی تھی۔

ادھم نے ہاتھ آگے کر کے اوپر نیچے ہلایا۔ نظروں کا ارتکاز ٹوٹا تو وہ کسی اور طرف دیکھنے لگی تھی۔

اب وہ چڑیا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دانوں کو دیکھ رہی تھی جن پر اس کا نام لکھا تھا۔

”زندگی میں پہلی دفعہ میرے حصے میں محمود کی ٹھکرائی ہوئی شے نہیں آئی۔“

اسے یوں لگا تھا جیسے ادھم نے وہی بات دہرائی ہو اور بار بار دہرائی ہو۔ مگر ادھم تو خاموش تھا۔ وہ تو کچھ کہہ ہی نہ رہا تھا۔

لب تو سل گئے۔ اب اندر کا شور کیسے کم ہو؟ وہ

www.pdf.pklibrary.com

مضطرب ہوئی تھی۔

''وہ وادیٔ برکان یا شہر بریدہ کی کوئی عالی شان عمارت ہو یا جامہ کی کسی بستی کا چھوٹا سا مکان۔ کھڑکی سے آسمان تو ایک جیسا ہی دکھتا ہے۔'' ادھم نے یکایک ہی حقیقی خاموشی کو توڑا تھا۔

نورسین کا اندرونی شور یکایک خاموشی میں ڈھلا تھا۔

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

ادھم کی بات کی تائید یا تردید کیے بنا وہ خاموشی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

ادھم نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔ اٹھی ہوئی مضطرب نگاہیں کچھ حیا سے، کچھ انہونے خوف سے جھک گئی تھیں۔

چند پل خاموشی کی نذر ہوئے پھر وہ کہنے لگا

''مجھے اندازہ ہے، یہ گھر تمہارے شایان شان نہیں۔''

''کیا میں نے کوئی شکوہ کیا؟'' نورسین کی جھکی نگاہوں میں کہیں کوئی خواب ٹوٹا تھا۔ آنکھیں بے اختیار نم ہوئی تھیں۔

''مگر تمہاری آنکھیں تو کر رہی ہیں۔''

نورسین نے چونک کر سر اٹھایا۔

ادھم کی فتح ہوئی تھی۔ اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم ابھرا تھا۔ امید بھرا۔ یقین بھرا تبسم۔

نورسین بے قراری سے لب کاٹتی باہر دیکھنے لگی تھی۔

بے حد محبت اور احترام سے۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر، اس کا رخ اپنی جانب موڑ کر ادھم ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔

وہ جز بز ہوئی تھی۔

''تم خائف ہو مجھ سے؟''

''نہ...... نہیں تو۔'' بے اختیار ہاتھ چھڑا کر اس نے چہرے پر منڈلاتی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑسا تھا۔ وہ ادھم کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

کسی خیال کے تحت ادھم یکایک ہی سناٹے میں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک معدوم ہوئی تھی اور لبوں کا تبسم بھی طلسم کی طرح ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔

یکایک ہی وہ دونوں۔ چھوٹے سے اس مکان کی پراسرار خاموشی میں ڈھل گئے تھے۔ ایک دوسرے کے بے حد قریب ہوتے ہوئے بھی دور ہوئے تھے۔

نورسین کا پورا وجود انہونے احساس کے تحت کانپ اٹھا تھا۔ وہی آواز دوبارہ گونجی تھی۔ مدھم شور یکایک ہی بلند ہوا تھا۔

''ناشتے کے لیے۔'' نورسین نے بمشکل حلق سے آواز نکالی تھی۔ ''ناشتے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

''کچھ نہیں۔'' ادھم کا لہجہ سرد تھا۔

اس سے قبل کہ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھتی، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

ایک آنسو ٹوٹ کر اس کے گال پر گرا تھا۔ عقب میں چڑیا شور مچاتی اڑان بھر گئی تھی۔ اسے اپنے حصے کا رزق جو مل چکا تھا۔

☆☆☆

کچھ پل بیتے۔ کچھ ساعتیں گزریں اور وہ اشتہا انگیز، خوشبو بکھیرتا لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھوں میں خاکی لفافے تھے۔ جن میں صبح کا ناشتا تھا۔ وہ ناشتا جو انہیں صبح کے سات بجے کرنا تھا وہ اب ساڑھے دس بجے ہو رہا تھا۔

''تاخیر کے لیے معذرت۔'' آتے ساتھ ہی اس نے نورسین سے کہا تھا۔ وہ جو بستر پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھی تھی فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''وہاں برتن رکھے ہیں، لے آؤ۔'' میز کی جانب بڑھتے اس نے بے لچک انداز میں اسے حکم دیا تھا اور وہ فوراً ہی برتن اٹھا لائی تھی۔

ادھم نے طشتری پر تلے ہوئے گوشت کے ٹکڑے نکال دیے تھے۔ ساتھ میں ابلے ہوئے آلو

www.pdf.pklibrary.com

اور انڈوں کے ساتھ ڈبل روٹیاں جمی ہیں۔
"یہ ام ہانی کی طرف سے ہے، یہ ام اسمعیل کی مہربانی ہے، اور یہ خالہ لطیفہ نے بھیجا ہے اور یہ نان عبدالکریم خباز کی طرف سے ہیں۔"
وہ ادھم کو دیکھ کر رہ گئی۔
"یہ سب ہمارے پڑوسی ہیں۔" اس نے بتایا۔
وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ خاموش نگاہوں سے اس کے چہرے کی مبہم تحریر کو کھوج رہی تھی۔ کہیں کوئی غصہ تھا۔ نہ ناراضی تھی۔ حالانکہ جاتے وقت اس کے تاثرات کچھ اچھے نہ تھے۔
"بیٹھو۔" کھانا طباق میں نکالتے ہوئے ادھم نے یکایک رک کر اس سے کہا۔ نورسین نے گڑبڑا کر اس کے چہرے سے نگاہ ہٹائی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر بے حد سکون سے اکلوتی رکابی میں گوشت کے ٹکڑے اور آلو نکالنے لگی تھی۔
انواع واقسام کی رکابیوں سے سجی میزوں پر کھانے والی نورسین امجاد بڑی رغبت سے زمین پر بیٹھ کر وہ سادہ سا ناشتا کر رہی تھی جو کبھی اس کی خادماؤں نے بھی نہ کیا ہوگا۔ ادھم بھی خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

معاملات کی سنگین نوعیت کو سمجھتے ہوئے کسی بھی قسم کی تلخ کلامی سے بچنے کے لیے اس نے والد کو لکھ دیا تھا کہ وہ آج بریدہ کے مضافات میں سیر کے لیے جا رہی ہے۔ تاکہ والد اور والدہ عنزی صاحب کے گھر آنے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ اس نے وہ خط ادھم کو بھی دکھایا تھا۔
خط پڑھنے کے بعد وہ کچھ دیر تک خاموش رہا پھر کہنے لگا۔
"تم اپنے والد سے یہ سب کب تک چھپاؤ گی؟"
نورسین چپ ہوگئی۔ یہ اس نے ابھی تک نہ سوچا تھا۔ مگر جس لہجے میں ادھم نے وہ سوال پوچھا تھا وہ لہجہ اسے بری طرح سے چبھا تھا۔

ایسے جیسے وہ اس سے کہہ رہا ہو کہ میرے ساتھ یہاں آنے کا فیصلہ تمہارا تھا اب تم اپنے اس فیصلے سے اتنی خائف کیوں ہو۔
اس کے لہجے کی نرمی کو سرد مہری میں، اور آواز کو خاموشی میں ڈھلتے دیر نہ لگتی تھی۔
"مناسب وقت پر بتا دیں گے۔" نورسین نے نرمی سے کہا۔
"اور یہ مناسب وقت کب آئے گا؟" وہ اس پل بہت اجنبی سا لگا تھا۔
نورسین شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی اور یہاں وہ ہزیمت کا شکار ہوا تھا۔
"میں نے اپنے مطالبات اور شرائط میں اس امر کو مقدم رکھا تھا کہ میں جہاں بھی رہوں گا، میری بیوی میرے ساتھ رہے گی۔ میں نے چچا سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ میری حیثیت کو ہو بہو اسی انداز میں پیش کریں گے جیسی کہ وہ ہے۔ اور وہ یہ سب واضح کرنے کے بعد ہی تمہارا ہاتھ مانگیں گے۔ مگر وہ مجھ سے کچھ اور کہتے رہے اور تمہارے والد سے کچھ اور......" اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد نورسین کو دیکھا۔ "اس میں نہ قصور میرا ہے نہ تمہارا مگر میں پھر بھی معافی چاہتا ہوں۔ چچا تو وہ آخر میرے ہی ہیں۔"
"میں نے کچھ نہیں کہا۔" اشارہ وضاحت کی طرف تھا۔
"تمہاری آنکھیں تو کہہ رہی ہیں۔"
نورسین سٹپٹا گئی۔ ادھم نے لبوں پر ابھرتی بے ساختہ مسکراہٹ کو بمشکل روکا۔ نورسین اسے ایسا کرتا دیکھ چکی تھی تبھی خفت چھپانے کو خاموشی سے اٹھ کر خواب گاہ میں آ گئی۔ اب وہ کسی ایسے کام کو تلاش کرنے لگی تھی جس میں غرق ہو کر وہ خود کو مصروف ظاہر کر سکے اور ادھم کو دوبارہ اس سے ہمکلام ہونے کا موقع نہ ملے۔
مگر وہاں تو کوئی بھی ایسا کام نہ تھا جو اس سے چند ساعتیں ہی لے لیتا۔


www.pdfbooksfree.pk / paksociety watermark

یونہی بستر کی چادر کو ٹھیک کرتے اس نے اپنے بیگ سے کپڑے نکالنا شروع کر دیے۔

''اب اگر تم نے اپنے والد کو خط میں سیر کا حوالہ دے ہی دیا ہے تو کیوں نہ ہم اس تحریر میں حقیقت کا رنگ بھر دیں؟'' ادھم عقب میں نمودار ہوا تھا۔ نورسین گھبرا گئی۔ وہ اس کے ہاتھوں سے ملبوسات لے کر سامنے ہی بیٹھ گیا تھا۔

''کیا خیال ہے؟''

''خ...... خیال تو برا نہیں مگر۔''

''مگر کیا؟''

''مگر کچھ نہیں۔'' اس نے فوراً ہار مان لی۔

''چلو پھر چلیں، بریدہ کے مضافات میں۔ جہاں جنت کی ہوائیں خوشبوؤں کے ہمراہ مچلتی ہیں۔''

☆☆☆

شادی کا پہلا دن ادھم کی سنگت میں شہر بریدہ کے مضافات میں چہل قدمی کرتے گزرا۔ وہ یہاں پہلے کبھی نہ آئی تھی اور نہ ہی اسے قدرت کے اس قدر حسین مقامات کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ان پہاڑیوں پر بھی چڑھی تھی جن پر وہ اکیلے نہیں چڑھ سکتی تھی اور ان جھیلوں میں بھی اتری تھی جن میں وہ اکیلے نہ اتر سکتی تھی۔

درخت، پتے، جڑی بوٹیوں، وادیوں جھیلوں، آبشاروں اور تیزی سے بہتے دریاؤں سے زندگی کا مفہوم ڈھونڈا تھا۔

قدرت کی ہر ایک شے آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ سکون قلب تھی۔ سکون آثار۔

شادی شدہ زندگی کا وہ پہلا دن ــــ ادھم کی سنگت میں گزرا، ایک ایک پل اس کے اندر کا خوف اور بے چینی کم کرنے کے لیے تھا۔ ادھم نے جیسے سوچ سمجھ کر گھومنے پھرنے کا لائحہ عمل تیار کیا تھا۔ وہ اسے ہر اس مقام پر لے گیا تھا جہاں وہ کچھ دیر کے لیے مبہوت ضرور ہو جاتی تھی۔

وہ اس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ مگر بے حد مختصر، جامع اور ڈھیر سارا مفہوم لیے ہوئے۔ زیادہ تر ان کے مابین خاموشی ہی ہم کلام کرتی تھی اور آنکھیں بے وفائی کر کے کچھ راز اگل دیتی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بے حد پر اسرار تھے۔ اسرار سے بھرپور۔ ماضی کی تلخ یادوں میں دبے ہوئے۔

دونوں کا ایک ماضی تھا۔ ایک حکایت تھی۔

جس کا عنوان واضح تھا۔ حکایت پوشیدہ۔

''پہلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو میری عمر پندرہ برس تھی۔''

جامہ کی نہر کے کنارے، جوتے ہاتھوں میں پکڑ کر ٹھنڈی نم گھاس پر چلتے اس نے ادھم بن مراد کو کہتے سنا تھا۔

''چچا نے محمود کا گھوڑا میرے حوالے کر دیا تھا اور میں نے......'' اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد گہرا سانس لیا۔ ''میں نے عبداللہ کی تلوار سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔''

نورسین ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔ ادھم بھی رک گیا تھا۔ وہ نورسین کے چہرے پر خوف کے تاثرات دیکھ سکتا تھا اور اپنے ہاتھ میں دبے اس کے داہنے ہاتھ کی لغزش کو بھی محسوس کر سکتا تھا۔

وہ حیران نہیں ہوئی تھی۔ اداس نہیں ہوئی تھی۔

وہ پریشان ہوئی تھی۔ خائف ہوئی تھی۔

''میری اس حرکت پر انہوں نے مجھے مارا پیٹا اور سزا کے طور پر اپنے ملازم کے ساتھ یہاں بھیج دیا۔'' نورسین کو سنجیدگی سے دیکھتے اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔ پھر وہ بے حد خاموشی سے سامنے دیکھنے لگا تھا۔ یوں جیسے ماضی کا ہر منظر نہر کی لہروں پر ابھرنے لگا ہو۔

''میں اپنے چچا کی ہر زیادتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور پھر وہ گھوڑا تو محمود کا تھا۔ میرا تو نہیں۔ میرا ہو بھی کیسے سکتا تھا وہ؟''

نورسین اپنی جگہ منجمد کھڑی تھی۔ ساکت۔ وہ سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی اور اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔ وہ خدشات میں گھرے ذہن کو صاف کرنے کی جستجو کر رہی تھی اور ذہن صاف نہیں ہو رہا

تھا۔ آوازیں بند نہیں ہو رہی تھیں۔ شور کم نہیں ہو رہا تھا۔

"مجھے اس کی ہر چیز پر اس کا نام لکھا ہوا نظر آتا ہے اور مجھے اس احساس سے، خیال سے شدید نفرت ہے۔"

خوف اور وحشت کے عالم میں وہ ادھم کے اس چہرے کو دیکھ رہی تھی جو یکا یک ہی دھندلا ہوا تھا۔

محمود کی ہر شے قابل نفرت تھی۔ قابل حقارت تھی۔

محمود کی ہر شے واجب القتل تھی۔ واجب عداوت تھی۔

"میں اپنی اس سزا سے کافی محظوظ ہوا تھا بالکل اسی طرح جس طرح تم ہو رہی ہو۔"

بے خبری کے عالم میں ادھم بن مراد نے ایک ایسی بات کہہ ڈالی تھی جس نے نورسین کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اب وہ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔

ادھم کی محمود سے نفرت بھڑکتی ہوئی اس آگ کی طرح تھی جو اس کے تنکوں سے بنے مکان کے قرب وجوار میں بڑی شدت سے بھڑک رہی تھی۔ چاروں طرف سے بھڑک رہی تھی۔ اور کسی بھی لمحے۔ وہ اس گھر کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی جسے وہ صبر وتحمل سے تعمیر کر رہی تھی۔

"یا رب تیری رحمت کا سوال۔" دل ہی دل میں اس نے شدت سے اس رازداں کو پکارا تھا جو اس کی نیت سے بخوبی واقف تھا۔

"کیا ہوا؟" ادھم نے اچانک سے پوچھا۔

"کچھ...... کچھ نہیں۔" نورسین نے چہرے پر منڈلاتی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑسا۔ اور اپنے چہرے کے تاثرات کو حتی الامکان سنبھالنے کی کوشش کی۔

"کیا واقعی؟"

"ہاں۔"

"مان لیتا ہوں۔" وہ اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کیے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس رات نورسین باوجود کوشش کے بھی سو نہ سکی تھی۔

☆☆☆

وہ روز ہی جامعہ کے مضافات میں گھومتے پھرتے تھے۔ ہلکی پھلکی باتیں کرتے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی، پرکھنے کی از سر نو کوشش کرتے تھے۔

مجسم خاموشی پگھلنے لگی تھی۔ اجنبیت کا لبادہ اترنے لگا تھا۔ نامانوس ماحول میں انسیت کے رنگ گھلنے لگے تھے۔

ادھم نے نورسین کو قبول کیا تھا۔

نورسین نے ادھم کو۔

اور یہ حقیقت کافی تھی انہیں محبت، عزت اور اہمیت کے ہر احساس سے سرشار کرنے کے لیے۔ مگر ادھم کی اندرونی تلخی جب ایک لحظے کے لیے بھی عیاں ہوتی تو نورسین کا خون خشک ہو جاتا۔

محمود کا ذکر رنج وغم اذیت کے سوا کچھ نہ لاتا۔

حقیقت عیاں نہ ہو یہ اس کی صدا تھی۔

ماضی مخفی رہے یہ اس کی دعا تھی۔

وہ روز اپنے رزاق سے محبت مانگتی تھی۔ عزت مانگتی تھی اور شادی شدہ زندگی میں استحکام کی طلب رکھتی تھی۔

اور اسی لیے وہ ادھم بن مراد کو اپنا پاسباں سمجھنے لگی تھی۔ خوف، دہشت، کے باوجود اس پر بھروسا کرنے لگی تھی۔

وہ شوہر تھا اس کا۔ ہمسفر۔ شادی ہو چکی تھی اس سے۔ رب نے تو فرض کر دیا تھا اس پر کہ اگر وہ اس کے ساتھ اچھا ہے تو وہ اس رشتے کو نبھائے اور خوش اسلوبی سے نبھائے اور وہ اس فرض کو نبھا رہی تھی۔

اس کی کوشش تھی کہ وہ بھی ادھم کا ساتھ دے۔

جب وہ ہنسے تو وہ بھی ہنسے۔ جب وہ مسکرائے تو وہ بھی مسکرائے۔ جب وہ بات کرے تو وہ بھی بولے اور جب وہ سوال کرے تو وہ بھی جواب دے۔

وقت چاہیے تھا اسے خود کو اس روپ میں

www.pdf.pklibrary.com

ڈھالنے کے لیے۔

اور اسے یہ وقت عطا کر دیا گیا تھا۔ اور وہ سنبھال رہی تھی خود کو۔ صبر و تحمل سے اس زندگی کو گزار رہی تھی احسن طریقے سے جسے اس نے سزا سمجھا تھا۔

☆☆☆

"تم اسم با مسمّٰی ہو۔"

سیاہ دھاری۔ سفید دھاری سے ابھی جدا نہ ہوئی تھی۔ دبیز تاریکی میں۔ لالٹین اٹھائے وہ ادھم بن مراد کو فجر کی نماز کے لیے دروازے پر چھوڑنے آئی تھی جب اس نے رک کر مدھم آواز میں کہا تھا۔

اور وہ سر اٹھائے حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

ادھم کے عقب میں وسیع و عریض آسمان تھا۔ تاروں سے سجا ہوا۔ بے شمار نجوم کے مرکز میں ایک ہی چاند تھا۔ وہ دھرتی کے ہر کونے ہر گلی، ہر کوچے میں اپنی نقرئی روشنی پھینک رہا تھا۔

نورسین کی نگاہ بے اختیار اسی چاند کی جانب اٹھی تھی۔ ادھم نے لالٹین کا دیا بجھا دیا۔ ایک لمحے کے لیے اندھیرا ہوا پھر چاند کی نقرئی کرنیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔

"نورسین۔ نور۔ چاند کا نور۔ چاند کی روشنی۔"

وہ بے حد ادب و احترام سے جھک کر کہنے لگا تھا۔

"تمہارا وجود میرے لیے تمہارے نام کی طرح ہے۔ میری زندگی تاریک تھی۔ میرا وجود تاریک تھا۔ میرے احساسات اور جذبات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ میری کوئی قدر۔ کوئی منزلت نہ تھی۔ میں ان اندھیروں میں بھٹک رہا تھا جو میرے اپنوں نے میرے لیے تیار کر رکھے تھے۔ اور پھر میری زندگی میں تم آ گئیں۔"

وہ ایک لمحے کو رکا۔ رات کے اس اندھیرے میں نورسین ادھم بن مراد کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کی شدت دیکھ سکتی تھی۔

"اظہار محبت کے فن سے میں ناواقف ہوں مگر۔ میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں نورسین! میری زندگی میں تمہاری موجودگی اس چاند کی طرح ہے۔"

اس نے اشارہ کر کے کہا۔ "اور تم میرے لیے اتنی ہی اہم، اتنی ہی ضروری ہو جتنی کہ زمین والوں کے لیے یہ چاند۔"

نورسین آنکھوں میں نمی لیے ادھم بن مراد کی سرخ آنکھوں میں احساسات کی ان تحریروں کو پڑھنے لگی جو اس سے مخفی تھیں۔

"تمہارا شکریہ میری زندگی میں آنے کے لیے! مجھے قبول کرنے کے لیے! اور مجھے محبت کی روشنی دان کرنے کے لیے۔"

وہ سیدھا ہوا۔ مسکرایا۔ اور دروازے کی چوکھٹ عبور کر گیا۔ نورسین اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ دل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ وہ چاہ کر بھی خوش نہ ہو سکی تھی۔ ایک خوف۔ ایک خدشہ۔ جو ننگی تلوار کی طرح سر پر لٹک رہا تھا۔

دروازہ بند ہوا تو اس نے پلکیں جھپکیں۔ آنسو ٹوٹ کر گرے اور وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

محبت!!

عزت!!

احترام!!

یقین!!

اعتماد!!

اور ایک گھر!!

سب عطا کر دیا گیا تھا اسے۔ سب..... مگر ایک خدشہ۔ ایک خلش۔ ایک احساس۔ اذیت بھرے احساس کے ساتھ "کہ اگر ادھم کو علم ہو گیا تو؟"

"زندگی میں پہلی بار میرے حصے میں محمود کی ٹھکرائی ہوئی شے نہیں آئی۔"

اور نورسین نے احساس جرم میں مبتلا ہو کر کرب کے عالم میں آنکھیں میچ لی تھیں۔

اس کی آزمائش تو کبھی ختم ہی نہ ہوئی تھی۔۔ وہ تو جیسے اب شروع ہوئی تھی۔

☆☆☆

www.pdf.pklibrary.com

"اپنا خیال رکھنا۔" ادھم کی آواز نے ایک لمحے کے لیے جیسے اس کے تخیلات پر طاری جمود کو توڑا تو وہ اٹھ کر صحن میں آگئی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اس نے ہاتھ کے اشارے سے الوداع کیا۔ اس نے بھی مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

دروازہ بند ہوا تو وہ اندر آگئی۔

ذہن میں تصور کی سرزمین پر ایک بار پھر آندھی سی چلی۔ منفی خیال مثبت خیال سے متصادم ہوئے۔ اور جو سچ تھا۔ حق تھا۔ وہ ایک بار پھر اس پر واضح ہوا تھا۔

ادھم بن مراد کی سنگت میں اس نے فقط سترہ دن گزارے تھے اور وہ سترہ دن گزشتہ سات سالوں پر بھاری تھے۔ ایام کا سالوں سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ کہ وہ عزت، احترام اور سچی محبت کی جن ساعتوں پر مشتمل تھے، وہ سات سالوں میں کسی طور نہ سمائی تھیں۔

ادھم بن مراد کی قربت میں رہ کر ہی اسے محبت کی پہچان ہوئی تھی۔ محبت سے بڑھ کر عزت، احترام اور عہد کی پاس داری کا انکشاف ہوا تھا۔ عزت، احترام اور وعدوں کا پاس ہے تو محبت ہے۔ ورنہ سب خیال ہے۔ خواب ہے۔ سراب ہے۔

محبت، احترام، چاہت۔ ان جذبوں سے تو جیسے وہ اب واقف ہوئی تھی۔ بیوی کے روپ میں۔ اپنے شوہر کے ایک ایک جذبے کی حق دار ٹھہر کر اسے اب احساس ہوا تھا کہ نکاح کے دو بولوں میں کتنی طاقت ہوتی ہے اور رب کائنات کو گواہ بنا کر جب دو لوگ ایک ہوتے ہیں تو اس کی رحمت سے زندگی آسودہ اور خوش حال کیسے ہوتی ہے۔ اسے تو یہی لگا کرتا تھا کہ وہ خوش نہیں رہ پائے گی۔ اسے تو یہ لگا کرتا تھا کہ وہ سزا کا انتخاب کر بیٹھی ہے۔ مگر یہ زندگی غم تو ہرگز نہ تھی۔ یہ محبت سزا تو ہرگز نہ تھی۔

بستر کی چادر درست کرتے، کھڑکی کے پردوں کو ڈوروں میں باندھتے، میز پوش کو جھاڑتے، برتنوں کو الماری میں ترتیب سے رکھتے وہ سوچ

خیالوں میں اتنی گم تھی کہ بیرونی دروازے کی دستک اس کی سوچ پر طاری اس جمود کو توڑ ہی نہ سکی تھی جس نے کچھ دیر کے لیے ہی سہی اسے اطراف سے یکسر بے نیاز کر دیا تھا۔

دستک تیز ہوئی تو آواز بھی بلند ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ سے کانچ کا ظرف چھوٹ کر زمین پر گرتے ہی چھناکے سے ٹوٹا تھا۔

والد!!!!

نورسین کا سانس رک گیا۔ وہ پتھر ہوگئی۔

"دروازہ کھولو، نورسین۔"

بوکھلاہٹ کا شکار ہونے کے باوجود اپنی جگہ سے ہل نہیں پا رہی تھی۔

"نورسین۔" والد دروازہ پیٹ رہے تھے۔ شدید غصے کے عالم میں وہ جیسے لکڑی کے پھاٹک کو توڑ دینا چاہتے تھے۔

ہمت مجتمع کر کے۔ وہ نہ جانے کیسے دروازے تک پہنچی تھی اور پھر نہ جانے کیسے اس نے کپکپاتی انگلیوں سے کنڈی ہٹائی تھی۔ دروازہ دھڑام سے کھلا تھا۔ باہر کا منظر یکایک ہی واضح ہوا تھا۔

سامنے اس کے والد کھڑے تھے۔ عقب میں ان کے ملازمین تھے۔ اور ان کے وسط میں کہیں محمود عتزی موجود تھا۔

نورسین کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کی روح کانپنے لگی۔

والد نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا تھا۔ اس کا ماتھا چوم کر، اس کا ہاتھ پکڑ کر جیسے اس کی خیریت جاننے کی کوشش کی اور وہ ہکا بکا ساکت سی کھڑی ان کا چہرہ تکنے لگی تھی۔

ان کی آنکھوں میں جو خون اترا ہوا تھا وہ اسے لہولہان کر رہا تھا۔ ان کے سخت تاثرات کی جو تپش تھی وہ اسے جھلسا رہی تھی۔

"زندہ نہیں چھوڑوں گا میں اس دھوکے باز، مکار انسان کو۔"

www.pdf.pklibrary.com نے کچھ کہنا چاہا مگر

آواز نے ساتھ نہ دیا۔
والد نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ بستی کے لوگوں کے ہجوم کو چیرتے وہ اسے اس چھوٹے سے غریب خانے سے دور لے جانے لگے جو اس کے لیے سکون قلب کا ایک امین مرکز تھا۔ ایک پناہ گاہ۔ جو اسے ماضی کی آندھیوں سے محفوظ رکھتی تھی۔ جو اسے خوبصورت مستقبل کی خوابیدہ حکایتوں کو نغموں میں ڈھال کر سناتی تھی۔
وہ گھر۔ مقام۔ پناہ گاہ۔ وہ اس کے لیے ایک ثانیے میں دھندلا گئی تھی۔
وہ اب اپنے گھر کے ادھ کھلے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے والد کے آدمیوں کو اس گھر میں بے رحمی سے گھستے اور اس میں توڑ پھوڑ کرتا دیکھ رہی تھی۔ پوری دنیا یکا یک ہی اس کے لیے تاریک ہوئی تھی۔
ہر آواز بند ہوئی۔ ہر خیال جامد ہوا اور وہ صدمے کی کیفیت میں گھوڑا گاڑی تک پہنچتے پہنچتے زمین پر ڈھے گئی۔
سب ختم ہونے کو تھا۔ سب بدل جانے کو تھا۔ اب کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ وہ ایک بار پھر برکان کے جنگل میں تنہا کھڑی رہ جائے گی۔ وہ ایک بار پھر ماضی کی چھوٹی بڑی ہر غلطی، ہر غیر درست فیصلے کی زنجیروں میں باندھ دی جائے گی۔
سزا!
عوض!
اس نے گھوڑا گاڑی میں سوار ہوتے ہی کرب کے عالم میں آنکھیں میچ لی تھیں۔
☆☆☆
”خلع ؟“
والد نے عجیب بات کہہ دی تھی۔ ہلا دینے والی۔ لرزا دینے والی۔
لمحوں میں سب بدلا تھا۔ سب بکھرا تھا اور وہ ساکت وجامد اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔
اس کی رضا، اس کی رغبت جانے بغیر والد اتنی بڑی بات سوچ بھی کیسے سکتے تھے۔ اتنا بڑا فیصلہ کر بھی کیسے سکتے تھے؟
وہ اس سے وہ گھر چھین لینا چاہتے تھے جس نے اسے دکھ وآلام کی بارشوں میں پناہ دی تھی۔ وہ اس سے وہ مکان لے لینا چاہتے تھے جو محبت کے ستونوں پر ایستادہ ہوا تھا۔ جو ماضی کی تلخیوں سے اسے محفوظ رکھتا تھا۔
والد ایسا کیسے کر سکتے تھے؟ کیسے سوچ سکتے تھے؟ وہ ایسا نہ ہونے دے گی، ہرگز نہیں...... کبھی نہیں۔
”میں ادھم کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں والدی! مجھے طلاق نہیں چاہیے۔“ ہمت مجتمع کر کے اس نے کہہ دیا تھا۔
والد کو سکتہ سا ہوا تھا ایک لمحے کے لیے۔ انہوں نے نورسین کو بے یقینی سے دیکھا۔ یوں جیسے وہ اپنی نازوں پلی بیٹی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یوں جیسے وہ اسے جاننے کی، پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔
کیا یہ وہی نورسین تھی۔ ان کی بیٹی، ان کا خون، ان کی لخت جگر۔ جس نے اس گھر میں آسائش کا ہر رنگ، ہر بہار، ہر انعام دیکھا تھا۔ جس کی میز انواع واقسام کے لذیذ کھانوں سے سجی رہتی تھی۔ جس کے ہر کام کے لیے ہمہ وقت ملازم مستعد رہتے تھے۔ کیا یہ وہی نورسین تھی؟
مگر ان کی نورسین تو ایسی ہرگز نہ تھی۔ ان کی نورسین تو اس گھر سے پچیس دن پہلے رخصت ہو کر جا چکی تھی۔ اب جو سامنے کھڑی تھی وہ تو کوئی اور تھی۔
”تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“
”مجھے جانے دیں والد! مجھے اپنے گھر جانے دیں۔“ وہ ادھم بن مراد کی بیوی تھی۔ اپنے شوہر کے لیے ان کے سامنے ڈٹ گئی تھی۔
”کیا وہ جگہ گھر کہلانے کے لائق بھی ہے نورسین؟“ انہوں نے کرب کے عالم میں اسے کندھوں سے تھام کر پوچھا تھا۔
www.pdf.pklibrary.com

والد اندر سے کٹ کر رہ گئے۔

"یہ میری غلطی ہے۔ میں نے تمہیں ادھم سے شادی پر مجبور کیا۔ میں نے تمہیں تپتی ہوئی اس آگ میں جھونک دیا۔ میں نے اس کی خاندانی جاہ و حشم کو دیکھا مگر اسے نہ دیکھا۔ اس کے کردار کو نہ دیکھا۔ اس کی شخصیت کو نہ دیکھا۔ میں نے تم پر ظلم کیا نورسین۔ میں نے تم پر ظلم کیا۔"

"ایسا نہیں ہے والد!" اس نے نمناک آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے روکا۔

"ادھم سے شادی میرا اپنا فیصلہ تھا۔ میرا ذاتی۔ اس میں آپ کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اگر میں اس سے شادی نہ کرنا چاہتی تو آپ مجھے مجبور نہیں کر سکتے تھے۔"

"پھر بھی نورسین تم اس طرح کیسے رہو گی۔ اس گھر میں۔"

"والد! یاد ہے، آپ کہا کرتے تھے کہ لڑکیوں کی جب شادی ہو جاتی ہے تو وہ اپنے شوہر کے گھر اپنے حصے کا رزق خود لے کر جاتی ہیں؟"

ایک لمحے کے لیے امجاد حجی چپ ہوئے تھے۔

"یہ میرے حصے کا رزق تھا جو میں اس گھر سے اپنے ساتھ وہاں لے جا چکی ہوں۔ کوئی بھی انسان مجھ سے میرا وہ رزق نہیں چھین سکتا جو اللہ نے میرے حصے میں لکھ دیا ہے اور میں اس میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔"

"نورسین!"

"وہ ایک اچھا انسان ہے والد۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میری عزت کرتا ہے۔ میرے لیے یہ احساس ہر آسائش سے بڑھ کر ہے۔"

"اچھا انسان؟ دھوکے باز مکار ہے وہ۔ وہ تو اپنے چچا کے ساتھ بھی دھوکا کرتا رہا۔" وہ پھر کر بولے تھے۔

"ساری غلطی ادھم کی تھی۔ سارا قصور ادھم کا تھا۔ انہوں نے بھی اذیت جھیلی تھی۔ انہوں نے بھی دھوکا کھایا تھا۔" والد عزمی صاحب کی زبان بول

چپ ہوئے تو نورسین نے سر اٹھایا۔

"میں نے ادھم میں خیر کے سوا دیکھا۔" اس نے پورے وثوق۔ پورے یقین سے ایک ایک لفظ اطمینان سے ادا کیا تھا۔ "میں واپس جانا چاہتی ہوں والد۔"

"مگر میں ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گا۔ یا تو وہ کسی اچھی جگہ تمہاری رہائش کا بندوبست کرے یا پھر تمہیں طلاق دے۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہی ادھم کے نام خط لکھنا شروع کر دیا تھا۔

"اللہ کے لیے ایسا مت کریں۔ کوئی شرط نہ رکھیں۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں آپ مجھے جانے دیں۔"

مگر والد نے ایک لفظ نہ سنا اور خط لکھ کر ادھم کو بھجوا دیا۔

اگلے چند دن اور راتیں نورسین کے لیے بے حد مشکل تھیں۔ ایک ایک لمحہ جیسے اس نے انتظار کی سولی پر لٹک کر گزارا تھا۔

والد نے جواب کے لیے ادھم کو ایک ہفتے کی مہلت دی تھی اور اب ہفتہ گزرنے کو تھا مگر ادھم کی طرف سے امجاد حجی کے مطالبات کا کوئی جواب موصول نہ ہوا تھا۔

"اسے تمہاری پروا نہیں، ہرگز پروا نہیں۔" والد ہر روز اسے جتاتے تھے اور وہ خاموشی سے سن کر مجرموں کی طرح سر جھکا لیتی تھی۔

سندس آئے روز چکر لگا رہی تھی۔ تخلیہ میں اس کی طنزیہ نگاہیں اور معنی خیز مسکراہٹیں نورسین کو اندر تک چھلنی کر دیتی تھیں۔ جبکہ والدین کے سامنے وہ اسے خود سے لپٹا کر آنسو بہاتی تھی۔ شادی کے فیصلے پر ناراضی کا اظہار کر کے اپنے بہن ہونے کا حق جتاتی تھی۔ مگر غیر موجودگی میں وہ لفظوں کے زہریلے نشتر چبھونے سے باز نہ رہتی۔

"میں نے کہا تھا، تم پچھتاؤ گی۔ بہت پچھتاؤ گی۔ ... ہیں تو نئے پچھتاوے

www.pdfpklibrary.com

چاہیے تھے۔"
اور نورسین چپ سادھ لیتی۔ کہتی بھی تو کیا؟ اس نے تو ویسے بھی سندس کو جواب دینا چھوڑ دیا تھا۔
وہ سات دن تو اس نے جیسے تیسے گزار لیے تھے مگر آٹھویں دن جب والد نے قاضی سے ملاقات کا حتمی فیصلہ سنایا تو نورسین کو اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔
"والد! ایسا نہ کریں۔" وہ ایک بار پھر ان کے سامنے گڑگڑائی تھی۔
"اس منحوس کو تمہاری پرواہ تک نہیں ہے اور تم اس کی خاطر رو رہی ہو؟" نورسین کو روتا دیکھ کر وہ اس پر چلا اٹھے تھے۔ "سات دن گزر چکے، اس نے پلٹ کر تمہاری خبر تک نہ لی۔ میرے خط کا جواب تک نہ دیا اور تم اس کے لیے رو رہی ہو؟ اس غیر ذمہ دار انسان کے لیے؟"
"آپ بس مجھے جانے دیں۔" اس نے منت کی۔ "مجھے طلاق نہیں چاہیے والد! رب کے لیے میری بات مان لیں۔"
والدہ پریشان کھڑی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا بیٹی کا ساتھ دیں یا شوہر کا۔
"ہم خلع کے لیے ابھی اور اسی وقت قاضی کے پاس جا رہے ہیں۔" والد تحکم سے کہہ کر اٹھ گئے تھے۔
"میں دارالقضاء میں قاضی سے صاف صاف کہہ دوں گی، مجھے طلاق نہیں چاہیے۔" عقب میں وہ چلا اٹھی۔
والد کے قدموں کی حرکت تھم گئی تھی۔ مٹھیاں بھینچ کر وہ غصے کے عالم میں پلٹ کر اسے دیکھنے لگے تھے۔
وہ نم آنکھوں کے ساتھ چٹانوں کی سی مضبوطی لیے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے پہلی بار والد کو اپنی ہمت دکھائی تھی۔ اپنا فیصلہ سنایا تھا۔
"یہ میرے رب کا حکم ہے کہ اگر مجھے اس میں کوئی عیب نظر نہیں آ رہا تو میں اس سے طلاق لوں۔ مجھے کم از کم اللہ کے ساتھ تو مخلص ہو جانے دیں والد۔"
مجلس میں یکایک خاموشی چھا گئی۔ اتنی خاموشی کہ نورسین خائف ہو گئی۔ پریشان ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر والد کو دیکھا۔
وہ ساکت تھے۔ جیسے ہر دلیل، ہر حجت دم توڑ گئی ہو۔ جیسے انکار کی، اصرار کی مزید کوئی گنجائش ہی نہ رہی ہو۔ مگر انا کے وہ بھی پکے تھے۔ ناراضی سے مڑ کر گئے تو اس شب واپس نہ آئے۔ البتہ ملازم کے ذریعے اسے پیغام بھجوا دیا گیا کہ وہ اپنے گھر جا سکتی ہے۔
مگر وہ کیسے جاتی؟ یوں والد کو خفا کر کے۔ خوشی اور غم دو کشتیوں پر ایک ساتھ پاؤں کیسے دھرتی؟
اس نے صبح تک ان کا انتظار کیا پر وہ نہ آئے۔ ظہر سے عصر اور پھر مغرب تک وہ سارا دن والد کے انتظار میں بے قراری سے صحن کے چکر کاٹتی رہی مگر نہ انہوں نے آنا تھا نہ وہ آئے۔
اتنی ناراضی؟ صرف اس لیے کہ وہ اپنے حق کے لیے بولی تھی؟ ڈٹ گئی تھی؟ اس لیے کہ اس نے اپنا گھر بچانے کی جستجو کی تھی؟ والد کے لیے یہ سب عام کیوں تھا؟ آسان کیوں تھا؟ صرف اس لیے کہ وہ ایک امیر تاجر تھے؟ جس کی بیٹی کو اپنانے کے لیے کوئی بھی دولت مند شخص بخوشی راضی ہو سکتا تھا؟ مگر اس کے جذبات کا کیا؟ احساسات کا کیا؟
اسے اپنے والد کی فطرت کا علم تھا۔ ان کے غصہ، انا کی سختیوں سے واقف تھی۔
اب شاید وہ اس گھر میں نہ آ سکے۔
کبھی نہ آ سکے۔
یہ بھی سزا تھی۔ سزا کا ہی ایک روپ!
صبر نورسین! صبر!!
اگلے دن صبح کے پرنور اجالے میں ماں سے مل کر وہ نازک کندھوں پر بھاری بوجھ سہارے گھر سے چلی گئی تھی۔

☆☆☆www.pdf.pklibrary.com

گھر کی حالت ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ چولہا سرد تھا۔ صحن کے پھول پودے خشک۔ مرجھائے ہوئے۔ ہر شے پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ گھر میں زندگی کے آثار ہی نہ تھے۔ اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔ کسی انہونے خوف سے۔ خیال سے۔

دروازہ آہستہ سے کھول کر جب اس نے خواب گاہ میں قدم دھرے تو اندھیرے کو مات دیتی سورج کی روشنی چہار کونے پھیلی تھی۔

سامنے ہی بستر پر وہ پڑا تھا۔ پسینے سے شرابور۔ بے سدھ۔

نورسین کے قدم یک دم بھاری ہوئے۔ اس نے کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا دیے۔ کھڑکیاں بھی کھول دیں۔ بستر پر بیٹھتے ہوئے اس نے ادھم کا ہاتھ پکڑ کر اسے پکارا تو اس نے اپنے چہرے پر سے بازو ہٹاتے اور نیم کھلی آنکھوں سے نورسین کو دیکھا۔

نورسین کو سکتہ سا ہو گیا۔

ادھم کی سفید قمیص کی آستین خون سے سرخ تھی۔ پیشانی پر گہرے زخم سے بھی خون رس رہا تھا۔ داہنے گال پر سوزش تھی۔ ہونٹ کے کونے پر بھی ضرب کا نشان۔

"ادھم۔" نورسین نے آنکھوں کی نمی کو پیتے ہوئے اس کی پیشانی سے بہتے خون کو اپنی انگلیوں سے پونچھا۔

ادھم نیم وا، خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی سماعت کام نہیں کر رہی تھی تب ہی وہ اسے جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس کی بصارت ساتھ نہیں دے رہی تھی تب ہی وہ ردعمل نہیں دے رہا تھا۔

نورسین پریشانی کے عالم میں کسی کو مدد کے لیے بلانے کے لیے اٹھی تھی کہ ادھم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ رک کر ادھم کی جانب متوجہ ہوئی۔ اگلے چند ثانیے بمشکل گزرے تھے پھر وہ کسی قدر کوشش سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ نورسین کو دیکھنے لگا تھا۔ خاموشی سے۔ یکسوئی سے۔

اس کا چہرہ زرد تھا۔ لب خشک اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ گہری نیند سے ابھی کچھ دیر پہلے ہی بیدار ہوا تھا مگر اس کی آنکھوں کی سرخی جیسے اس کے رتجگے کی گواہی دے رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں کوئی شکوہ تھا نہ شکایت۔ بس ایک سوال تھا۔ استفسار تھا۔ حیرت تھی۔ استعجاب تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ "تم آ گئیں نورسین؟ تم کیسے آ گئیں؟"

"ادھم! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا لی۔"

نورسین رو پڑی۔

گہری سانس لے کر۔ اس نے آنکھوں کو یونہی رگڑ ڈالا تھا۔ کہ نورسین دھندلا گئی تھی۔ واضح نظر ہی نہ آ رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر کسی خیال کا، خواب کا روپ دھارنے لگی تھی اور وہ ہرگز ایسا نہ چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنے پاس دیکھنا چاہتا تھا۔ محسوس کرنا چاہتا تھا۔ مگر جانے کیوں۔ منظر واضح نہ ہو رہا تھا۔ حالانکہ سب روشن تھا۔ دن کے اجالے کی طرح۔ اس کے باوجود نورسین اسے نظر نہ آ رہی تھی۔

اس نے ادھم کو پانی پلایا پھر تکیے کے سہارے بٹھاتے ہوئے اس کی خیریت پوچھنے لگی۔

"کیا والد کے آدمیوں نے تمہیں بہت مارا پیٹا؟"

"نہیں، کچھ زیادہ نہیں۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔ نورسین کا وجود اندر سے چھلنی ہو گیا۔

"یہ زخم تو کل رات کا ہے۔" ادھم نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر وضاحت دی۔

"میں گر گیا تھا۔ میرا سر میز سے ٹکرا گیا، اس میں تمہارے والد کا تو کوئی قصور نہیں۔ میز انہوں نے تو نہیں رکھی تھی وہاں۔ میں نے رکھی تھی۔ پھر پانی کا ظرف بھی تو میں نے۔ خود توڑا تھا ان کا تو کوئی عمل دخل نہیں۔"

نورسین کو اور رونا آیا۔

"تم نے کئی دنوں سے کھانا بھی نہیں کھایا ادھم"

www.pdf.pklibrary.com

''تمہاری جدائی کا غم مجھے کھا رہا تھا، میں کیسے کچھ کھالیتا۔''

نورسین اپنی جگہ سن ہوئی۔ ادھم کی محبت اسے ہمیشہ رلاتی تھی۔ آج بھی رلا رہی تھی۔

''یہ حقیقت ہے۔ میری بھوک مر گئی تھی۔'' ادھم نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

''خدارا نورسین! اب کہیں مت جانا۔'' اس کے لیے اب بھی اس کی موجودگی ایک خواب سی تھی۔ وہ اب بھی ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ خیال سوچ رہا تھا۔

ادھم کے ہاتھوں پر نورسین کی گرفت یکا یک مضبوط ہوئی۔

''تم آرام کرو، میں تمہارے لیے کھانا بناتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

ادھم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ عالم الاحلام کی سرحدوں میں کہیں آگے نکل گیا تھا۔ نورسین اپنی آنکھیں پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

اگلے تین دن ادھم کی تیمارداری میں صرف ہوئے تھے۔ اس نے جو اپنی حالت بنالی تھی۔ اسے بہتر ہونے میں کچھ وقت تو لگنا تھا اور پھر بستی والوں کے عتاب سے بچنے کے لیے بھی ادھم اپنا بستر نہیں چھوڑ رہا تھا جو اس تمام عرصے میں یہی سمجھتے رہے تھے کہ وہ گھر میں موجود نہیں۔ پڑوسی عیادت کے لیے آتے تو وہ نیند کا بہانہ کیے بستر میں دبکا رہتا۔ سامنا کم ہی کرتا۔ جواب بھی کم ہی دیتا۔

چوتھے دن آئینے میں اپنے چہرے کو کافی دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد اس نے نورسین کو بتایا کہ اسے پیشانی پر لگے زخم اور اس کی نشان کی بے حد فکر ہے۔

نورسین اسے دیکھ کر رہ گئی۔ یہ بات اس کے لیے حیران کن تھی کیونکہ ادھم کے سینے بازو اور پشت پر مندمل زخموں کے بے شمار نشان موجود تھے جن کی موجودگی اسے ہرگز پریشان نہ کرتی تھی مگر آج وہ زخم کی ایک چھوٹی سی مگر گہری لکیر سے پریشان ہو رہا تھا۔

''زخموں کے نشان پوشیدہ ہی اچھے لگتے ہیں۔'' صحن میں پودوں کو پانی دیتے اس نے ادھم کی بات سنی اور وہیں رک گئی۔ پانی کی بالٹی ہاتھوں میں نہ جانے کیوں لڑکھڑا سی گئی تھی۔

اس نے بالٹی نیچے رکھ کر ادھم کو دیکھا۔ وہ عین سامنے سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔

اس کے گال کی سوزش کچھ کم ہو چکی تھی اور ہونٹوں کا زخم بھی مندمل ہو چکا تھا مگر داہنی آنکھ کے اوپر جو لکیر تھی وہ بے حد گہری تھی۔ واضح تھی۔

''لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ زخم چھپائے نہیں جاسکتے۔'' اس نے آئینہ ہٹا کر گہری سانس لی۔

''یہ زخم بھی مندمل ہو جائے گا۔'' نورسین نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے، اس کی پیشانی پر بالوں کو بکھیرتے ہوئے تسلی دی تھی۔

''مگر نشان باقی رہے گا۔'' ادھم نے بے ساختہ کہا تھا اور نورسین ایک ثانیے میں اپنی گھائل ہوتی روح کی چیخ وپکار میں سن ہو کر رہ گئی۔

''نشان باقی رہ جانے سے کیا ہوتا ہے۔'' اس نے ضبط کرتے ہوئے بمشکل کہا۔ ''ادھم! بات تو یہ ہے کہ درد نہ رہے۔'' اس لمحے اسے اپنے لفظ کھوکھلے لگے تھے۔

''بعض درد بڑے عجیب ہوتے ہیں نورسین! وہ باقی رہتے ہیں۔ زخم ٹھیک ہو جائے تب بھی۔ مندمل ہو جائے تب بھی۔'' ادھم گہری سانس لے کر سامنے دیکھنے لگا تھا۔

نورسین نے اپنے لباس کے دامن کو مٹھیوں میں پکڑ لیا۔ اندر سے پورا وجود ہل سا گیا تھا حالانکہ بات تو کچھ ایسی نہ تھی۔

آخر وہ ادھم کی ادنیٰ سی بات پر بھی اپنی روح کی گہرائیوں میں کیوں اتر جاتی ہے؟ کیوں اپنے زخم نوچنے لگتی ہے؟ اپنے درد جھنجھوڑنے لگتی ہے؟

ادھم نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی

www.pdf.pklibrary.com

بجائی۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
"تم نے بتایا نہیں، تمہارے والد نے تمہیں کیسے آنے دیا۔"
"ان کے پاس اعتراض کا کوئی جواز نہیں تھا۔"
وہ اب اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی تھی۔
"مگر تمہاری آنکھیں تو کچھ اور کہہ رہی ہیں۔"
"کیا کہہ رہی ہیں میری آنکھیں؟" اس نے چہرہ ادھم کی جانب موڑا۔
"یہی کہ...... ادھم......! تمہاری بیوی تمام کشتیاں جلا کر آئی ہے۔"
اور نورسین باوجود کوشش کے بھی اس کی بات رد نہ کر سکی۔ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔
"ہونا تو یہی تھا کیونکہ والد نے تمہیں خط لکھا تھا اور تم نے اس کا جواب نہیں دیا تھا۔"
اب کے ادھم جو چپ ہوا تو ان کے مابین اس موضوع پر دوبارہ کوئی بات نہ ہوئی۔

☆☆☆

ہفتے کا دن تھا۔ وہ ام اسمعیل کے ساتھ بازار سے خریداری کے بعد اکیلی اپنے گھر جا رہی تھی کہ گلی میں موڑ مڑتے ہی کوئی اچانک سے نمودار ہوا تھا اور نورسین چونک کر جھٹکے سے رک گئی تھی۔
محمود!
عزی صاحب کے بیٹے کو بے یقینی سے دیکھتے سامان کے تھیلے پر اس کی گرفت مضبوط ہوئی تھی۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کا تنفس بھی تیز ہو گیا چکا تھا
محمود اور یہاں۔
جماسہ کی عام سی بستی میں۔
عام سی رد کی جانے والی نورسین کی سامنے۔۔
نورسین دو قدم پیچھے ہٹی تھی پھر وہ تیزی سے مڑ کر جانے ہی لگی تھی کہ وہ سرعت سے اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔
"میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔" اس نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے محمود کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ نہیں ہٹا تھا۔
"نورسین! تم میری بات تو سنو۔"
وہ وحشت کے عالم میں مڑ گئی اور خود پر ضبط کیے واپس بازار کی طرف جانے لگی۔
"اگر آج تم نے میری بات نہ سنی تو میں اسی طرح بار بار تمہارے راستے میں آتا رہوں گا۔ میں ادھم کے سامنے بھی آنے سے گریز نہیں کروں گا۔"
نورسین کے قدموں کی حرکت یک لخت تھمی تھی۔ تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ محمود نے اس کے خوف کا فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ ادھم کی خود سے نفرت اور عداوت سے واقف تھا۔ بہت اچھی طرح سے واقف تھا۔
"میری بات سن لو نورسین۔"
نورسین آنکھوں میں غیض و غضب لیے اسے مڑ کر دیکھنے لگی تھی۔
وہ عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔
گلی کے اس پار چلتے پھرتے لوگوں کی آوازیں سب معدوم ہونے لگیں۔ گھر مکان نفی ہو گئے۔ بس ایک تنگ و تاریک دوراہے پر اب اسے وہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سنائی دے رہا تھا۔
"مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں نے تمہارے حق میں غلط کیا۔" چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ "اور مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ مجھے یہ احساس کافی دیر سے ہوا۔ بالکل محبت کے اس احساس کی طرح جسے میں اپنا وہم۔ اپنا خیال سمجھ کر جھٹلاتا رہا۔ مگر نورسین۔ محبت تو مجھے صرف تم سے ہوئی تھی۔ صرف تم سے۔"
نورسین کی مٹھیاں بھنچیں۔ کان کی لوئیں گرم ہوئیں۔ وہ اپنے اندر اچانک سے بھڑک اٹھنے والی اس آگ کی تپش کو محسوس کر سکتی تھی جس نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔
"میں...... میں تمہیں اب بھی چاہتا ہوں نورسین! دل و جان سے چاہتا ہوں۔ خدا گواہ ہے

www.pdf.pklibrary.com

تمہاری جدائی میں مجھے ایک پل کے لیے بھی سکون نہیں۔" اس نے اپنی آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔

"تم جیت گئیں نورسین۔ تم نے مجھ سے انتقام کے لیے جو قدم اٹھایا اس نے مجھے برباد کر کے رکھ دیا۔ مجھے کسی پل چین نہیں۔"

نورسین کا تنفس تیز تھا۔ آنکھیں اشک آلود۔ اس کے چہرے پر وحشت رقص کر رہی تھی۔

"میں ہار گیا نورسین! تم جیت گئیں۔ خدا کے لیے اپنی اس سزا کو ختم کر دو۔ ادھم کو چھوڑ دو۔ میں۔ میں سندس کو چھوڑ دوں گا تمہارے لیے۔ ہم شادی کر لیں گے۔ میں......"

اس سے قبل کہ اس کی بات مکمل ہوتی، نورسین کی طرف سے پڑنے والے زناٹے دار تھپڑ نے اس کے لبوں کو ساکت کر دیا۔ اس کے کھوکھلے لفظ یہاں وہاں بکھر گئے۔

وہ گال پر ہاتھ رکھے، صدمے سے گنگ حیرت و بے یقینی سے نورسین کو دیکھنے لگا تھا۔

"ن......ور۔"

"ایک لفظ اور نہیں۔" نورسین نے وحشت کے عالم میں ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے تنبیہ دی تھی۔ "تم اس حد تک گر جاؤ گے مجھے اس کا ہرگز اندازہ نہ تھا۔ تم اس طرح سے میرا کھیل تماشا بناؤ مجھے اس کا ہرگز گمان نہ تھا! گھٹیا انسان! آئندہ میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔"

وہ تیزی سے جانے کے لیے مڑ گئی تھی اور وہ سنسان گلی میں اپنے سرخ پڑتے گال پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

وہ جو ٹھکرانے والوں میں سے تھا۔ آج اسے ٹھکرا دیا گیا تھا۔

بے دردی سے۔ بے رحمی سے۔

وہ جو مٹی میں ملانے والا تھا۔ آج اسے خاک کر دیا گیا تھا۔ ذلالت سے۔ حقارت سے۔ وہ جس نے شکست کا چہرہ تک نہ دیکھا تھا وہ آج احساس [illegible] کی بازی میں ہارا تھا۔ بہت بری طرح سے ہارا تھا۔

کیا کبھی ایسا ہوا تھا کہ اس نے کسی شے کی طلب کی ہو اور وہ اسے عطا نہ کی گئی ہو؟ خواہش۔ جسے دل میں پناہ دی ہو اور پھر وہ پوری نہ ہوئی ہو؟

وہ اب بھی نورسین کو دیکھ رہا تھا۔ بے یقینی سے۔ حیرت سے۔

ایک فیصلے نے سب تباہ کیا تھا۔ ایک مطالبے نے سب راکھ کیا تھا۔ کھیل اب بھی نصیب کا تھا۔ قسمت کا تھا۔ مگر چال الٹی چلی تھی۔ اس لیے خالی ہاتھ ہی دامن تھا۔

☆☆☆

اس کا خیال تھا محمود عنزی تھپڑ اور بے عزتی کے بعد دوبارہ اس کے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کرے گا مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ وہ اس کے سامنے آیا تھا۔ اس کے راستے میں آیا تھا اور اس کے لیے ناعبور ہونے والی ایک مستقل رکاوٹ بن گیا تھا۔ وہ وہاں تھا۔ ہر جگہ۔ ہر گلی۔ ہر کوچے میں۔ وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ سرے سے اسے چھوڑ نہیں رہا تھا۔

گزشتہ روز وہ یونہی۔ ایک بار پھر اس کے راستے میں آیا تھا۔ اس مرتبہ اس نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس نے نورسین کے پیروں تلے سے زمین تک کھینچ لی تھی۔

وہ حق دق بے یقینی کے عالم میں محمود العنزی کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔ کیا یہ وہی شخص تھا جسے اس نے سات سال چاہا تھا۔ سات سال جس کے ہمراہ اندھے اعتماد کی وادیوں میں کھوئی رہی تھی۔ وہ تو لمحوں کے لائق بھی نہ تھا اور اس نے پورے سات سال گنوا دیے تھے۔ پورے سات سال!

نورسین کا دماغ ماؤف تھا۔ سانس خشک ہو چکا تھا۔ وہ صدمے کے عالم میں محمود العنزی کی بے رحم آنکھوں میں اپنے لیے رحم تلاشنے لگی تھی مگر وہاں تو کچھ نہ تھا۔ نہ محبت تھی۔ نہ رحم تھا۔ نہ عزت تھی۔

[illegible] ہم کو چھوڑ دو ورنہ میں

www.pdfpklibrary.com

تمہارے تمام خطوط اسے بھجوا دوں گا۔ بلکہ میں اسے خود دینے آؤں گا۔"

وہ ایک جھٹکے سے مڑ کر اپنے گھر کو بھاگ گئی تھی۔

یہ کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ؟ زندگی اپنے مدار پر گھومنے لگی تھی تو یونہی اچانک سب کچھ درہم برہم کیوں ہونے لگا تھا؟ اس نے تو خود کو بدل دیا تھا پھر اس کی قسمت، اس کا نصیب اس کے حالات کیوں نہیں بدل رہے تھے؟

اس رات وہ باوجود کوشش کے بھی سو نہ سکی تھی۔ وہ ڈر گئی تھی۔ محمود سے کچھ بعید نہ تھا۔ اگر وہ دھوکا دے کر اسے ٹھکرا سکتا تھا تو وہ یہ بھی کر سکتا تھا۔ اگر وہ گھٹیا پن دکھا کر اسے دھمکا سکتا تھا تو وہ اپنی دھمکی پر عمل بھی کر سکتا تھا۔

خوف اور پریشانی کی وجہ سے اس نے کچھ دنوں کے لیے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ تاہم وہ اس سے پیچھا نہ چھڑا سکی۔

صبح سویرے جب ادھم کام پر چلا جاتا تو محمود اسے گلی کے نکڑ پر کھڑا نظر آتا تھا۔ کبھی کبھار وہ دروازے تک آ جاتا تھا۔ دستک بھی دے دیتا تھا۔ کھڑکی کو بھی دیکھ لیتا تھا یوں جیسے اسے معلوم ہو کہ نورسین اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ جواب لینے کے لیے آتا تھا۔ اس کا حتمی فیصلہ سننے کے لیے آتا تھا۔ وہ اسے برباد کرنے کے لیے آتا تھا۔

وہ رنج و الم کے قبرستان میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفنا دینا چاہتا تھا۔

نورسین کے چہرے کی رنگت ہر وقت اڑی رہتی تھی۔ خوف اور وحشت سے دل شدت سے دھڑکتا رہتا۔ آنے والا ہر لمحہ اس کے لیے اس وقت تک اذیت بنا رہتا جب تک گزر نہ جاتا۔ اس کے لیے وہ وقت بے سکونی اور بے قراری کے سوا کچھ نہ لاتا تھا۔ اس کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ بھوک مٹ گئی تھی۔ گھر کے کسی کام میں دل لگتا تھا نہ ہی چاہ رہی تھی۔

ادھم نے بارہا اس سے پریشانی کا سبب پوچھا تھا مگر وہ سر درد یا معمولی سی طبیعت خرابی کا بہانا کر کے ٹال دیتی تھی۔ وہ اسے بتاتی بھی تو کیا؟ کیسے؟ کس طرح؟

ادھم کی ہر پکار اسے بری طرح سے چونکا دیتی تھی۔ اس کی ہر بات اسے ہلا دیتی تھی۔ سب ٹوٹنے کو، بکھرنے کو، مٹنے کو تھا۔ زندگی ختم ہونے کو تھی۔

وہ راتوں کو چھپ کر، رو رو کر، گڑگڑا کر اللہ سے دعا مانگتی تھی۔ رحم کے لیے تڑپتی روتی تھی۔ بلبلاتی تھی مگر اسے کسی پل سکون نہ ملتا تھا۔

خوف ہی خوف تھا۔

وحشت ہی وحشت تھی۔ ہر طرف بے سکونی کا راج تھا۔

شاید یہ اس کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ محمود نے گھر کی گلی میں آنا چھوڑ دیا۔ احتیاطاً وہ روز ہی کھڑکی سے جھانکتی مگر وہ دکھائی نہ دیتا۔ ادھم کے ساتھ وہ کئی مرتبہ بازار بھی گئی۔ جامعہ کے باغات میں بھی گھومی پھری مگر وہ اسے اپنے قرب و جوار میں کہیں بھی نظر نہ آیا۔

یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ اسے کچھ تسلی سی ہوئی تھی۔ سکون سا ملا تھا۔ لیکن محض ایک دن کے لیے۔ کیونکہ اگلی رات جب وہ کھانے کے بعد برتن سمیٹ رہی تھی تو گھر کے بیرونی دروازے پر اچانک دستک ہوئی تھی۔

"رات کے اس پہر کون ہو سکتا ہے؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

ادھم بھٹی میں جلتی آگ کے سامنے اپنے اوزار پھیلائے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مصروف تھا کہ اسے دستک کی آواز نہ آئی تھی۔

"ادھم باہر کوئی ہے۔" اس نے متوجہ کیا۔

ادھم نے سر اٹھا کر آواز سنی پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

نورسین دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔ ظروف اس کے ہاتھوں میں تھا۔

www.pdf.pklibrary.com

"کون؟"

ادھم پوچھ رہا تھا۔ مگر اسے جواب نہیں مل رہا تھا۔

دستک دوبارہ ہوئی۔ اب کے پہلے کی نسبت زیادہ شدت سے کنڈی کھڑکائی گئی تھی۔

ادھم نے کنڈی کھینچ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے محمود کھڑا تھا۔ عنزی صاحب کا بیٹا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں کچھ تھا۔ کاغذات۔ خطوط کا پلندہ۔

نورسین کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی گئی تھی۔ سر پر آسمان توڑ دیا گیا تھا اور وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

نورسین ادھم کے عقب میں کھڑی تھی۔ دروازے کے قریب۔ دیوار کے سہارے۔ محمود العنزی سامنے تھا مگر وہ ادھم بن مراد کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھی۔

وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ قہر بار نظروں سے ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے۔ قدیمی عداوت نے جیسے شریانوں میں دوڑتے خون میں جگہ بنالی تھی۔ تب ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے نفرت، غصہ اور حقارت کے سوا کچھ نہ رکھتے تھے۔

شدت سے دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اللہ کو پوری قوت سے پکارا تھا۔ آواز شاید آسمانوں تک گئی تھی۔ شاید اس سے بھی اوپر۔

اسے پردہ چاہیے تھا اس وقت۔ اپنے عیبوں پر پردہ۔ ماضی پر پردہ۔

"کیوں آئے ہو یہاں۔"

"اندر تو لے آئے ہو، بیٹھنے کو نہیں کہو گے۔" محمود نے دل شکن انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"جو بات کرنے آئے ہو وہ کرو اور یہاں سے چلتے بنو۔"

"بات اتنی چھوٹی تو ہرگز نہیں ہے کہ چند ثانیوں میں مکمل ہو جائے۔" نورسین کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے ادھم بن مراد کو جیسے بھڑکتی ہوئی آگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔

ادھم کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ کچھ غلط ہے۔ کچھ غلط ہونے جا رہا ہے۔

"یہ ایک تحفہ ہے جو میں تمہیں شادی کے دن ہی دینا چاہ رہا تھا مگر کچھ مصروفیات کی بنا پر نہ دے سکا۔" اس نے خطوط کا پلندہ ادھم کی جانب بڑھایا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" ادھم نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"کھول کر دیکھ لو۔"

"میرے پاس فرصت نہیں۔" ادھم نے خطوط کے پلندے پر سے نظر ہٹائی اور میز پر بکھرے اوزار سمیٹنے لگا۔ محمود کو اس کی یہ حرکت تاؤ دلا گئی۔ ضبط کر کے وہ کچھ آگے ہوا۔

"یہ تمہاری بیوی کے وہ خطوط ہیں جو پچھلے سات سالوں میں وہ مجھے لکھتی رہی ہے۔"

ادھم کے ہاتھوں سے لوہے کا اوزار چھوٹ کر نیچے جا گرا۔

نورسین کے ہاتھوں سے ظرف پھسل گیا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے لمبے چوڑے مرد کو روح کی گہرائیوں تک کٹتے دیکھا۔ بے اعتباری کی گہری آگ میں جھلستے دیکھا۔

ادھم ساکت ہوا تھا۔ وہ پھر پتھر کی طرح ساکت ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ محمود نے تاثرات سے عاری چہرے کے ساتھ خطوط کا پلندہ میز پر اچھال دیا تھا۔

"بہت سادہ ہو تم ادھم! کتنی آسانی سے بے وقوف بن جاتے ہو۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "کبھی تم نے سوچا نہیں کہ اس نے تم سے شادی کی ہامی کیوں بھری؟"

نورسین نے اپنی روشنی کو پھیکا پڑتے، اپنے اثر کو مٹتے دیکھا۔ اس نے خود کو مرتے اور پھر دفن ہوتے دیکھا۔ محمود کی زبان زہر اگل رہی تھی۔ وہ اسے لہولہان کر رہی تھی۔

www.pdf.pklibrary.com

”مجھ سے اور اپنی بہن سے انتقام کے لیے اس نے تمہارا انتخاب کیا۔ تم سے شادی کر لی کہ شاید اس طرح مجھے فرق پڑے۔“

نورسین نے سن ہوتے وجود کے ساتھ پلکیں جھپکیں۔ اندھیرے یکایک بڑھ گئے تھے۔ اسے اپنے وجود کی بے نام روشنی میں ادھم نظر نہیں آرہا تھا۔

”مجھے محمود کی ٹھکرائی ہوئی ہر شے سے نفرت ہے۔“ چھوٹے سے مکان میں اس کی آواز بازگشت بن کر گونجی تھی۔ ”مجھے نفرت ہے محمود کی رد کی ہوئی کسی بھی چیز سے۔“ بھٹی میں جلتی آگ بھی جیسے بھٹی تک محدود نہ رہی تھی۔ وہ باہر نکل آئی تھی۔ اس کے گھر کو راکھ کر رہی تھی۔ اسے جھلسا رہی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ دل رکنے لگا تھا۔

محمود، ادھم کو دیکھ رہا تھا۔ مگر ادھم خاموش تھا۔ وہ ساکت تھا کسی مجسمے کی طرح۔ قوت گویائی سے محروم۔

”میں تمہیں بتاتا تو تم یقین نہ کرتے، اس لیے ثبوت بھی لے آیا! حالانکہ تمہیں تو کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا۔ ہے نا! تمہیں تو ویسے بھی عادت ہے میری ٹھکرائی ہوئی اشیاء کو استعمال کرنے کی۔“ اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی جس نے لمحوں میں نورسین کو آگ سے راکھ کیا تھا۔ اس نے اپنی ذلالت کا بدلہ لے لیا تھا۔ اپنے چھوٹے مکار نفس کو تسکین پہنچا دی تھی۔ اب وہاں مزید رکنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا تب ہی وہ معنی خیز نگاہوں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے جانے کے لیے مڑا تھا۔

”رکو۔“

ادھم کی آواز پر وہ چونک کر رک گیا۔ اسے حیرت ہوئی پھر وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔

ادھم نے میز پر سے خطوط کا پلندہ اٹھالیا۔

محمود کی مسکراہٹ یکایک گہری ہوئی۔ اس نے نورسین کو دیکھا۔ وہ تھرتھر کانپتی، بدلی دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ وہ ادھم کو دیکھ رہی تھی مگر ادھم اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کا شوہر۔ اس کا ہمسفر۔ ہم نوا

اسے نظر نہیں آرہا تھا۔

صدمہ گہرا تھا۔ نورسین کی ٹانگیں وزن اٹھانے سے انکاری ہو گئیں۔ ادھم کا رخ اسی جانب تھا۔ وہ خطوط کو لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مگر نورسین کی آنکھوں کی نمی پر منظر دھندلا رہی تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھی۔ تاثرات پڑھنے سے قاصر تھی۔

ادھم نے قدم اٹھائے۔ نورسین نے بمشکل سانس لیتے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آواز حلق سے نہ نکلی۔ لب ہل کر رہ گئے مگر وہ کوئی بھی وضاحت، دلیل، حجت دینے سے قاصر رہی۔

اور پھر اس نے ادھم کو اپنے قریب سے گزر کر بھٹی کی جانب بڑھتے دیکھا۔

محمود العزری کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔ کچھ ایسا ہو گیا تھا جو غیر متوقع تھا۔

”میری بیوی ماضی میں کیا کرتی رہی ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میری بیوی اب کیا کرتی ہے مجھے اس سے سروکار ہے۔“ وہ کھولے بغیر، پڑھے بنا ایک ایک کر کے تمام خط بھٹی کی آگ میں جھونک رہا تھا۔

نورسین حیران و ششدر اسے دیکھتی رہ گئی۔

”میں نے اپنی بیوی میں خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔“

وہ ایک ایک کر کے اس کے خوف کو، وحشت کو، بے سکونی کو شعلوں کے حوالے کر رہا تھا۔

محمود العزری سناٹے میں آگیا۔

”اللہ کسی کے ماضی کی بنیاد پر اس کے جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ نہیں کرے گا۔ میں تو پھر ایک انسان ہوں۔ میں اپنے جیسے کسی دوسرے انسان کے ماضی میں جھانکنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

محمود کی پیشانی کی رگیں پھول گئی تھیں۔ چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ اسے ادھم کی حرکت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”میں تمہیں اور چچا جان کو اپنی زندگی سے مزید

www.pdf.pklibrary.com

کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" پھر وہ آہستہ سے قدم اٹھاتا محمود کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"میرے حصے میں کبھی بھی تمہاری ٹھکرائی ہوئی شے نہیں آئی محمود! میرے حصے میں ہمیشہ وہی آیا جو میرا تھا۔ قلم سے لے کر، کتابیں، بستے کپڑوں تک۔ وہ ہر چیز میری تھی۔ وہ میرے والد کے پیسوں سے خریدی گئی تھی۔ تب ہی وہ تمہارے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی تھی۔ آج تم اپنی یہ غلط فہمی بھی دور کرلو بالکل اسی طرح جس طرح میں نے دور کرلی ہے۔"

نورسین نے چوکھٹ کو مضبوطی سے پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اس نے آنکھیں رگڑ کر محمود کو دیکھا۔ وہ مزید ایک لمحہ بھی ضائع کیے بنا گھر سے نکل گیا تھا۔

اس نے پھر ادھم کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔

نورسین اب بھی خائف تھی۔ وہ اب بھی وحشت میں مبتلا تھی۔

"ادھم! میں ایسی نہیں ہوں۔" وہ نورسین کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا تو وہ روتے بلکتے تڑپ کر بولی تھی۔ "میں نے۔ میں نے۔" اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جسم کانپ رہا تھا۔ "میں۔ ایسی نہیں۔ ہوں۔ میں نے غلط انسان پر اعتبار کر ڈالا تھا۔ یہ میری غلطی ہے مگر...... میرا یقین کرو میں...... میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا۔ میں دھوکے اور فریب کو۔ محبت کے نام سے۔ یاد نہیں رکھتی ادھم!"

ادھم نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر جیسے اسے مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھا تھا۔ نورسین نے سسکتے ہوئے اسے دیکھا۔

"دیکھو یہ تیسرا ظرف ہے جو ٹوٹ گیا ہے! خدا گواہ ہے میں نے اسے بریدہ کی ایک مہنگی ترین دکان سے خریدا تھا۔"

مگر نورسین کی توجہ کانچ کے اس ظرف کی طرف نہ گئی جو ابھی کچھ دیر قبل اس سے ٹوٹا تھا۔

"ادھم! وہ غلط کہہ رہا تھا۔" وہ اب بھی رو رہی تھی۔ شدت سے رو رہی تھی۔

"کیا میں نے تم سے کوئی وضاحت مانگی ہے نورسین؟"

نورسین کے آنسو ایک لمحے کے لیے تھمے۔ اس نے ادھم کی آنکھوں میں جھلملاتے اپنے عکس کو دیکھا۔

ادھم نے اس کے لرزتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اسی سکون اور تسلی سے اس نے نورسین کے آنسو صاف کیے۔

"شادی کی پہلی رات۔ جب تایا تمہارے سامنے مجھ پر الزام لگا رہے تھے تو اس لمحے میں نے شدت سے مرجانے کی خواہش کی تھی۔ اپنی نئی نویلی دلہن کے سامنے میں اپنی عزت کھو رہا تھا۔ میرے لیے یہ چھوٹی بات نہ تھی۔ مگر میں حیران تھا کہ تم نے ایک بار بھی مجھ سے وضاحت نہ مانگی۔ ایک بار بھی میرے ماضی میں جھانکنے کی کوشش نہ کی۔ تم نے مجھے قبول کیا۔ میری اچھائیوں اور ان برائیوں سمیت جن سے تمہیں چچا نے آگاہ کیا تھا۔ حالانکہ ان میں کوئی صداقت نہ تھی مگر میں پھر بھی ڈرتا تھا کہ اگر تم نے کبھی مجھ سے اس کے متعلق پوچھ لیا تو؟ کوئی وضاحت مانگ لی تو؟ میں تمہیں صفائی کیسے دوں گا؟ اور کیا تم مجھ پر یقین کرلو گی؟ میرا اعتبار کرلو گی؟

اس رات جب میں نے تمہیں رات کے اندھیرے میں گھر کے باہر بیٹھے دیکھا تھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو میرے ساتھ ہرگز نہ آتی۔ مگر وہاں تم تھیں نورسین۔ تم آگئی تھیں۔ حالانکہ چچا کے ساتھ ہونے والی اس تلخ کلامی کے بعد مجھے لگ رہا تھا کہ تمہیں اس رشتے کو ختم کرنے کی معقول وجہ مل گئی ہے مگر تم میرے لیے۔ میرے ساتھ گھر جانے کے لیے باہر آگئیں۔

شروع میں تمہارے خوف کی وجہ سے میں سمجھتا تھا کہ شاید تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو۔ شاید تمہیں

www.pdf.pklibrary.com

مجبور کیا گیا ہے۔ لیکن میں نے تمہیں جس حال میں بھی رکھا تم رہیں۔ شکوہ شکایت کیے بنا۔

جب تمہارے والد تمہیں لے کر چلے گئے تب مجھے ایک بار پھر یہی لگا کہ اب تم واپس نہیں آؤ گی۔ میں اب بھی تمہیں اپنی عام سی زندگی میں زبردستی رکھنے کا قائل نہیں تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا تم زبردستی کسی دباؤ میں آ کر یہ رشتہ نبھا رہی ہو۔ یقین نہیں آتا تھا کہ میں بھی کسی کے لیے اس قدر اہم ہو سکتا ہوں۔ کوئی میرے لیے بھی اتنی قربانیاں دے سکتا ہے۔ یہ سب میرے لیے نیا تھا۔ لیکن جب تم۔ اپنے والد کو بھی چھوڑ کر واپس آ گئیں تو اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں ہر بار تمہارے پیچھے نہ جا کر شدید غلطی کا مرتکب ٹھہر رہا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔" وہ رک گیا۔ چند ثانیوں کے بعد اس نے ایک بار پھر نورسین کو دیکھا۔

"میں تمہارے والد سے ملا تھا نورسین! تمہارے آنے سے ایک دن قبل ملا تھا ان سے۔ میں ان سے مہلت مانگنے گیا تھا۔ یہ عہد کرنے گیا تھا کہ میں ان کی بیٹی کے لیے گھر تعمیر کروں گا۔ اس کی چھوٹی بڑی ہر خواہش دل و جان سے پوری کروں گا۔ بس وہ رشتہ ختم کرنے کی بات نہ کریں۔ تمہارے والد بہت غصے میں تھے۔ کہنے لگے میری پاگل بیٹی کو تم میں خیر کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔" اس نے رک کر نورسین کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم محمود سے میری نفرت کو دیکھ کر ڈر گئیں۔ گھوڑے کے قتل کو سوچ کر سہم گئیں۔ فرق دیکھو نورسین! وہ پندرہ سالہ لڑکے کی نفرت تھی۔ یہ ستائیس سالہ مرد کی محبت ہے۔"

نورسین کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ ادھم کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ادھم! تمہارا شکریہ۔" ہچکیوں کے بیچ وہ بمشکل بول پائی۔ "تمہارا شکریہ۔ مجھ پر یقین کرنے کے لیے۔"

ادھم کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"یہ تم نے مجھے سکھایا ہے ورنہ میں تو یقین کرنا چھوڑ چکا تھا۔ شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے۔ اگر تم میری زندگی میں نہ آتیں تو میں کبھی سمجھ ہی نہ پاتا کہ میرے حصے میں محمود کی ٹھکرائی ہوئی شے تو کبھی نہیں آئی۔ میرے حصے میں ہمیشہ، ہر بار وہ آیا جو میرا نصیب تھا۔ جو میرے لیے ہی بنایا گیا تھا۔"

نورسین نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے دل کو قرار سا آ گیا تھا۔ وہ اب بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی مگر اس کی حالت پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ وہ مشکل گھڑی گزر گئی تھی۔ مگر اس کا اثر نورسین کی زندگی میں کچھ عرصے تک تو لازمی رہنے والا تھا۔

"چلیں۔"

ادھم کے سہارے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر داخل ہوتے وقت اس نے رک کر آسمان پر چودھویں کے مکمل چاند کو ایک نظر دیکھا جس کی کرنیں شام کے اس پہر دھرتی کے اندھیروں کو مات دیے ہوئے تھیں۔

اس رات وہ پرسکون ہو کر سوئی تھی۔ اس رات اس کے دل میں نہ خوف تھا۔ نہ دہشت تھی۔ نہ بے سکونی تھی کہ تاریک راتوں میں جو بادل چاند پر چھائے رہتے تھے وہ چھٹ گئے تھے کہ بے شمار ستاروں کی موجودگی میں بھی چاند نے اپنی اہمیت نہ کھوئی تھی۔

وہ عوض تھا جسے وہ سزا سمجھتی رہی تھی۔

وہ حقیقت تھی جسے وہ خیال گردانتی رہی تھی۔

فرق اس کی سوچ کا تھا۔ اس کے گمان کا تھا۔

آخر وہ نورسین تھی...... چاند کا نور...... اور چاند تو دبیز اندھیروں میں ہی اپنا آپ پہچانتا ہے۔

www.pdf.pklibrary.com

# URDU NOVELS MAG